لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

مجلس صحافت و نشریات۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد ۲۹ | ۱۰ جنوری ۱۹۹۲ء ـــــــ مطابق ۴ رجب ۱۴۱۲ھ | شمارہ ۵

ادارہ

ع۔ع۔ن

سرپرست

مولانا معین اللہ ندوی

نائب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ادارۂ تحریر

شمس الحق ندوی

محمود الازہار ندوی

مشاورت

مولانا نذر الحفیظ ندوی — مولانا سلمان حسینی ندوی

مولانا محمد خالد ندوی — مولانا عبد اللہ حسنی ندوی

مولانا محمد رضوان ندوی — ڈاکٹر ہارون رشید

خط و کتابت و منی آرڈر کا پتہ

منیجر تعمیر حیات پوسٹ بکس ۹۳

ندوۃ العلماء لکھنؤ 226007 (یوپی)

زر تعاون ملکی

سالانہ — پچاس روپے

فی شمارہ — ۲/۲۵

بیرون ملک فضائی ڈاک

ایشیائی، یورپی، افریقی و امریکی ممالک

۲۵ ڈالر

بیرون ملک بحری ڈاک

بحری ڈاک جملہ ۱۰ ڈالر

لوٹ :۔

ڈرافٹ سکریٹری مجلس صحافت و نشریات لکھنؤ کے نام سے بنائیں۔ اور دفتر تعمیر حیات کے پتہ پر روانہ کریں

○

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اگر آپ چاہتے ہیں کہ دین و ادب کا یہ خادم ندوۃ العلماء کا ترجمان آپ کی خدمت میں پہونچتا رہے تو سالانہ چندہ مبلغ پچاس روپے بذریعہ منی آرڈر دفتر تعمیر حیات کے پتہ پر ارسال فرمائیں

چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیں

نمبر یاد نہ ہونے کی صورت میں جس نام و پتہ پر تعمیر حیات جاتا ہے اسی صراحت منی آرڈر کوپن پر ضرور کریں

کلمۂ خبیثہ کا انجام

اشتراکیت اسی صدی کے دوسرے دہے (۱۹۱۷ء) میں "سرخ سویرا" بنکر ابھری، اور اسی صدی کے آخری دہے کا پہلا سال بھی ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ تاریخ کے اندھیرے میں ڈوب گئی۔ دنیا کی عظیم طاقت اور ناقابل تسخیر سطوت کی عمر ۷۴ سال ثابت ہوئی۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں اس کا قبضہ مشرقی یورپ اور ماوراء النہر کے ایشیائی مسلم ممالک پر ہو گیا تھا، اور سوویت یونین (یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلکس) کو مجلس شوریٰ (کانگریس آف سوویت سینٹس) کا پہلا اجلاس ماسکو میں منعقد ہوا جس میں "انا ربکم الاعلیٰ" کے ادعائے فرعونی کا اعادہ وقت کی زبان میں اس طرح کیا گیا کہ لینن کا وہ اعلانیہ پڑھ کر سنایا گیا۔ جس کے عنوان کا انگریزی ترجمہ اس طرح کیا جاتا ہے۔ ALL POWERS TO SOVIET "تمام طاقتیں اور اختیارات سوویت کے ہیں" اور ۱۹۹۱ء ختم دسمبر ہی کے مہینہ میں اسی ماسکو سے میخائل گورباچوف کی زبان سے دنیا نے یہ اعلان سنا کہ SOVIET CEASED TO EXIST "سوویت معدوم ہو گئی" جو طاقت فنا ہونے کے لئے ابھری تھی اس کے مٹ جانے پر کسی کو تعجب ہو تو ہو قرآن پر ایمان رکھنے والے کو کوئی حیرت نہیں ہو سکتی۔ اس کو معلوم ہے کہ:

فاما الزبد فیذھب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔

مگر کمیونزم کا جھاگ بہت منحوس تھا، اس میں انسانیت اور انسانی اقدار کے لئے مہلک ترین زہر چھپے تھے۔ اس کی تہ میں ہزاروں زہریلے، مارکسزم (سانپ بچھو) پوشیدہ تھے اس کا رخ جن ممالک کی طرف مڑا، بربادی کا سامان ساتھ گیا۔ مزدوروں اور محنت کش طبقہ کا نام لے کر اٹھا، ان کی حمایت، ہمدردی اور ان کے حقوق کا نعرہ بلند کیا۔ اور سب سے پہلے ان ہی کو ختم کیا۔ بخارا اور سمرقند، خارزمستان اور آذربائیجان کے مزدور اور محنت کش افراد لاکھوں لاکھ کی تعداد میں انتہائی بے دردی اور درندگی کے ساتھ اس طرح مارے گئے، جن کی تھوڑی بہت تفصیل بھی انسائیکلوپیڈیا آف کانگریس میں پڑھئے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ انسان کیا اس درجہ بھی درندہ ہو سکتا ہے؟ اور جو باقی رہ گئے ان پر عرصۂ حیات جس درجہ تنگ کر دیا گیا اس کی مثال انسانوں میں نہیں، جانوروں میں مل سکتی ہے ایک مقررہ چارہ کی طرح غذا مل جاتی، اور پھر بیلوں اور گھوڑوں کی طرح کام لیا جاتا، ان کو اس کی بھی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے متعلق کچھ سوچ سکیں۔ اوپر سے جمہوریت کا غلاف چڑھا رہتا تھا۔ الکشن کا ڈرامہ بھی ہوتا تھا۔ کوئی پارٹی یا کسی طرح کی تنظیم کی گنجائش نہ تھی۔ ایک پارٹی میں ایک ہی عقیدہ ایک ہی پروگرام اور ایک ہی نظام کے دو امیدوار ہوتے تھے، اور پوچھا جاتا تھا کہ تم کس کامریڈ کو پسند کرتے ہو X کو یا Z کو؟

مگر خدا کی قدرت کہ فرعون اور فرعونیت کو ختم کرانا جس ہاتھ سے مقدر تھا، اس کی پرورش فرعون ہی کے قصر شاہی میں ہوئی، اسی طرح یہ صاحب جو تاریخ کے ہیرو بن کر سامنے آئے ہیں، یعنی میخائل گورباچوف، ان کے بارے میں ہندوستان کی یونائیٹڈ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری "موہت سین" لکھتے ہیں:

"گورباچوف" پر تنقید کرنے والے جو بھی کہیں اور اس کو کمیونزم کو فنا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرائیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ گورباچوف "اس نظام (اشتراکیت) کا زائیدہ اور پروردہ تھا جس کا نام سوویت تھا" وہ اپنے عقیدہ و خیال میں اسی درجہ پختہ تھا جس طرح اسٹالن تھا۔" (ٹائمس آف انڈیا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۹۱ء)

موہت سین صاحب کے علاوہ بھی متعدد سیاسی و تاریخی معلومات رکھنے والے اہل قلم اور بین الاقوامی سیاسیات کے نبض شناس تبصرہ نگار لکھ رہے ہیں، کہ ۱۹۱۷ء کا انقلاب زیادہ اہم تھا یا ۱۹۹۱ء کا "انقلاب سوز" واقعہ؟ ۔ اگر سبب معاشی بدحالی کو سمجھا جائے تو سوال اٹھتا ہے کہ کیونکہ اس ہرے بھرے جنگل میں قحط کی آگ لگ گئی، یورپ اور ایشیائی ممالک کا مجموعہ جو زرخیزی میں مثال مانا جاتا ہے، جہاں لگا زراعتی

تعمیر حیات لکھنؤ

حصول علم کے لئے آسانی اور ہمت افزائی

پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی
صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی

آپ اسلام اور مسلمانوں کی جانب سے علم و علماء کی قدر دانی کے بارے میں مختصر واقعات پڑھ چکے ہیں جس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلام نے روز اول سے تعلیم و تعلم کی اہمیت پر زور دیا ہے بلکہ اسے ضروری قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں مسلمانوں نے اپنی اور اپنے ان بچوں کی تعلیم کے لئے بہتر سے بہتر انتظامات کئے اور مسجد ہی مدرسہ کی خشت اول بنی، وہ صرف طاعت و عبادت کے لئے ہی نہیں بنائی جاتی تھی بلکہ وہ مکتب اور مدرسہ بھی تھی جس میں مسلمان لکھنا پڑھنا، قرآن پاک کی تعلیم شرعی علوم زبان و ادب اور دوسرے مختلف علوم حاصل کرتے تھے، کچھ عرصہ کے بعد مسجد کی تعمیر کے پہلو بہ پہلو مکتب اور مدرسہ کی بھی بنیاد ڈالی جانے لگی جس میں لکھنا پڑھنا، قرآن پاک اور ابتدائی عربی زبان و حساب پڑھایا جاتا تھا اسے آپ آج کے پرائمری اسکول کہہ لیجئے اس طرح کے مکتب ایک ہی شہر میں بے شمار ہوتے تھے۔ ابن حوقل نے اسلامی دور کے ایک دور دراز شہر صقلیہ میں تین سو مکتب شمار کئے ہیں، بعض مکتب بہت بڑے اور وسیع ہوتے تھے اور اس کی شکل بڑے مدرسہ کی بن جاتی تھی جس میں سینکڑوں اور ہزاروں طلباء پڑھتے تھے ایک مشہور عالم ابو القاسم بلخی کے مکتب کے بارے میں مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ وہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں تین ہزار طالب علم پڑھتے تھے اور اس کا احاطہ اتنا وسیع تھا کہ نگرانی کے لئے وہ گدھے پر سوار ہو کر جایا کرتے تھے، بنو امیہ اور ان کے بعد بنو عباس کے زمانہ میں مختلف علوم و فنون کے لئے مدارس قائم کئے گئے اور ان کا نظام اور نصاب تعلیم ہمارے دور کے ہائر سکنڈری اسکولوں، کالجوں جیسا تھا۔ ان مدارس میں تعلیم مفت تھی اور ہر طبقہ، ذات اور گروہ کا طالب علم پڑھتا تھا، اور کسی قسم کا کوئی امتیاز یا فرق نہیں کیا جاتا تھا، ایک ہی وقت میں غریب لڑکا مالدار بچہ کے پاس بیٹھتا، تاجر، کاریگر اور کسان کا بچہ ایک ہی صف میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کر رہا تھا، اور نہ کسی کو کوئی اعتراض ہوتا۔ دور عباسی میں دمشق و تہذیب مدرسہ

کے قیام کے ساتھ ہی اس میں تعلیم کی دو شکلیں رکھی گئیں، اقامتی اور غیر اقامتی مدرسے مراد وہ مدرسہ تھا جس میں بورڈنگ ہاؤس تھے، پردیسی اور دور دراز کے طالب علم اور وہ طلباء جن کے سرپرست ان کے اخراجات نہ ادا کر سکتے تھے اس میں قیام کرتے اور ان کے رہنے، کھانے اور جملہ اخراجات مدرسہ برداشت کرتا۔ غیر اقامتی مدرسے سے مراد وہ مدرسہ تھا کہ جس میں طالب علم صبح کو پڑھتے اور شام کو اپنے گھر واپس ہو جاتے، اس بناء پر ایسے مدرسوں میں جن میں بورڈنگ ہاؤس ہوتے تھے ان میں مسجد، پڑھنے کے لئے ہال سونے کے کمرے، کتب خانہ، باورچی خانہ، غسل خانہ اور گودام ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ مدرسوں میں کھیل کود اور جسمانی ریاضت کے لئے کھلے میدان بھی ہوتے، عالم اسلام میں اب بھی اس دور کے باقی ماندہ مدرسے پائے جاتے ہیں، اس طرح کا پہلا مدرسہ مصر کے دار الحکومت قاہرہ آباد کرتے وقت خلیفہ المعز لدین اللہ کی فوج کے سپہ سالار جوہر صقلی نے قائم کیا اور اس کا نام جامع ازہر رکھا، جو دنیا کی سب سے قدیم اور عظیم درسگاہ ہے اور اب وسعت حاصل کر کے عظیم ترین یونیورسٹی بن چکی ہے جس میں نہ صرف تعلیم مفت ہے بلکہ طلباء کو وظیفے بھی ملتے ہیں اور مسلمانوں کے ہر ملک کے نام سے قیام گاہیں ہیں اس کے کچھ عرصہ کے بعد تونس میں جامع زیتونہ اور مراکش میں جامع قرویین کے نام سے دو درسگاہیں قائم کی گئیں جو اب تک کسی نہ کسی شکل میں اپنا تعلیمی پیغام پہونچا رہی ہیں قدیم اسلامی دور میں جن سربراہوں نے مدرسے قائم کرنے اور علم کی ترویج و اشاعت میں زیادہ دلچسپی لی ان میں سر فہرست سلطان نور الدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی اور خلافت عباسیہ کا نامور علم دوست وزیر نظام الملک طوسی تھے، چنانچہ سلطان نور الدین شہید نے صرف ملک شام میں ۱۴ نامور مدرسے تعمیر کئے، دمشق میں ۶، حلب میں ۴، حماۃ میں ۲، حمص میں ۱ اور بعلبک میں ایک مدرسہ قائم کیا، سلطان صلاح الدین

ایوبی نے اپنی سلطنت کے تمام شہروں، مصر، دمشق، موصل، اور بیت المقدس میں متعدد مدرسے قائم کئے، اور نظام الملک طوسی نے تو عراق اور ... مشرقی اسلامی علاقوں میں مدرسوں کا جال پھیلا دیا، ہر شہر اور گاؤں میں خواہ وہ کتنی ہی دور دراز مسافت پر واقع ہو مدرسہ قائم کیا، اس نے یہ بھی کہا کہ جس علاقہ، شہر یا گاؤں میں کسی ممتاز عالم اور نامور مدرس سے متعارف ہوا تو اس کے لئے مدرسہ قائم کر دیا، ان مدارس کے تمام اخراجات حکومت کے ذمہ تھے اس نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ سب سے بڑا اور وسیع پیمانہ پر قائم کیا جس میں پانچویں صدی ہجری سے لے کر نویں صدی ہجری تک ممتاز و نامور علماء تدریس کے فرائض انجام دیئے اور اس میں پڑھنے والے طلباء کی تعداد اس زمانہ میں چھ ہزار تھی، اس میں حکومت سے متعلق بڑے حاکم کا لڑکا اور معمولی مزدور کا بچہ ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتا تھا تعلیم اور جملہ اخراجات مفت دیئے جانے کے علاوہ خصوصی اوقاف سے غریب طالب علم کو وظیفہ بھی ملتا تھا۔ بادشاہوں اور وزیروں کے علاوہ تاجر حضرات اپنے اخراجات پر مدرسے تعمیر کرتے تھے، اور ان مدارس میں طلباء مفت تعلیم حاصل کرتے تھے، مشرق اسلامی میں اس طرح کے مدارس کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں مشہور اندلسی سیاح ابن جبیر، مدرسوں کی اتنی بڑی تعداد اور ان کی مالی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس نے مسلم مغربی علاقے والوں کو مشرق آنے اور تعلیم حاصل کرنے کی دعوت دی اور لکھا کہ: تمام مشرقی ممالک اور دمشق میں خاص طور سے طالب علموں کے لئے بے انتہا اوقاف ہیں۔ مغرب اسلامی کے بچوں میں سے جو بھی کامرانی چاہتا ہو تو وہ مشرق کا رخ کرے اسے حصول علم کے سلسلہ میں ہر آسانی میسر آئے گی، خاص طور سے معاش کی طرف سے بالکل بے فکری حاصل رہے گی۔"

ابن جبیر نے صرف دمشق کے آباد مدرسوں کی تعداد ۲۰ سو لکھی ہے اور کہا ہے کہ اگر کوئی پردیسی طالب علم دمشق آئے اور سال بھر قیام کرے تو وہ ہر مدرسہ میں صرف ایک رات گذار سکے گا۔" مثال کے طور پر سلطان نور الدین زنگی کے دمشق میں قائم کردہ مدرسہ نوریہ جسے دار الحدیث کے نام سے یاد کیا گیا اور اس میں ساتویں صدی ہجری کے عظیم محدث شیخ ابو زکریا یحییٰ نووی شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے، اس مدرسہ پر موقوفہ جائدادوں کی عظیم فہرست ملاحظہ ہو جو آج بھی اس کی باقی ماندہ عمارت کے دروازہ پر نقش ہے: دمشق کے گندم کے بازار کے تمام رومی طرز کے نئے غسل خانوں کی آمدنی، باب السلام کے باہر کا غذ فروشوں کے نئے دو غسل خانے کی آمدنی اور ان دونوں غسل خانوں سے ملحق محل کا غذیوں کے بازار کی آمدنی، باغ وزیر، جوزہ کے باغ کی دو تہائی آمدنی، باب الجابیہ کے باہر کی گیارہ دوکانیں اور ان کے مشرق میں واقع میدان اور گاؤں داریا کے نو کھیتوں کی آمدنی اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے وقف ہے۔ دمشق کے اس دار الحدیث کی بوسیدہ عمارت آج بھی دمشق میں (سوق الخیاطین) درزیوں کے بازار میں موجود ہے اس کا ایوان لیکچر ہال، مسجد دار الاساتذہ صدر مدرس کا رہائشی مکان، طلباء کا ہوسٹل اور مدرسہ کے ملازموں کے مکانات اب بھی باقی ہیں۔ کھانے کا ہال، باورچی خانہ اور غلہ کے گودام پر پڑوسیوں نے قبضہ کر لیا ہے، آخر میں مشہور سیاح ابن جبیر کا اس مدرسہ کے بارے میں یہ تاثر پڑھ لیجئے: سلطان نور الدین کا یہ مدرسہ دنیا کے عظیم الشان اور خوبصورت ترین مدرسوں میں سے ہے اس کی عمارت ایک خوشنما محل ہے اس کے درمیان میں فوارہ کے ذریعہ پانی ایک بڑے دریا میں گرتا ہے پھر وہ صاف شفاف پانی نالیوں کے ذریعہ پورے مدرسے کو سیراب کرتا ہے بڑا دلکش اور دلآویز منظر ہوتا ہے جسے نگاہ والے نے کبھی کاہے کو دیکھا ہو گا۔

علاء الدین ٹی

ٹی کمپنی بمبئی

ALAUDDIN TEA

Tea Co.

44, Haji Building,
S.V. Patel Road, Null Bazar, Bombay 400 003.
Tele: Add CUPKETTLE Tel: 862220/8728708

ٹکنولوجی بھی اسی طرح ترقی یافتہ تھی جس طرح اسلحہ سازی کی ٹکنولوجی جس کا دنیا بھر پر رعب تھا جو تسخیر فضا کا دعویدار تھا جس کے بنائے ہوئے ٹینک اور حملہ آور ہوائی جہاز کا دبدبہ اس درجہ قائم تھا کہ بہت سے ملک اس کے سہارے ہی کی میر پر کھڑے تھے، خود اس ملک ہندوستان کی ... فیصد دفاعی ضروریات کا جو کفیل تھا ... سال میں یعنی ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۱ء تک کی مدت میں کایا پلٹ کس طرح ہوگئی کہ اس کے باشندے دانے دانے کے محتاج ہوگئے اور جہاں اس نظام کی ... کے لئے ۹۹ء۹۹ فیصد ووٹ پڑتے تھے، وہاں ایک ایک فرد اپنی بیزاری اور نفرت کا اظہار اس طرح کر رہا ہے جیسے پنجروں سے نکل بھاگنے والے پرند آزادی کا سانس لے کر چہچہا رہے ہوں۔

میکسیکو کے ایک نوبل پرائز یافتہ شاعر اور ادیب اوکتاویو پاز OCTAVIO PAZ جو ہندوستان میں اپنے ملک کے سفیر رہ چکے ہیں لکھتے ہیں: "سیاسی اور اقتصادی نظریات کا موجودہ خلا اس بیسویں صدی کی تاریخ کا ثمرہ ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد جو نظام تمدن آیا، اس کے نتیجہ میں شکست و ریخت کی جو صورت حال پیدا ہوئی ہے، موجودہ خلا اسی کا مظہر ہے۔ ۱۹۳۰ء والی دہائی کی ابتداء سے بہت سے لوگوں کا خیال ہو چلا تھا، جنمیں میں خود بھی ہوں کہ موجودہ انسانی معاشروں میں جو تضاد اور باہمی کشمکش ہے اس کو صرف اشتراکی انقلاب دور کرسکتا ہے۔ مگر ہم اسی زمانہ سے ان تجربات کی ناکامی بھی دیکھ رہے ہیں جو ۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب کے ساتھ نمودار ہونا شروع ہوگئی تھی۔ اس نظام نے ہر میدان میں ناکامی کا منہ دیکھا اخلاقی، اجتماعی، اقتصادی ہر محاذ پر شکست کھائی صرف سیاسی یا فوجی مورچے ایسے ہیں جہاں اس کو کامیابی ہوئی۔"

(ٹائمس آف انڈیا ۲۵ دسمبر ۱۹۹۱ء)

بالشویک BOLSHEVIC کا بغاوتی انقلاب مذاہب و ادیان کے مکمل انکار کا داعی تھا۔ مذاہب و ادیان کے بارے میں سرخ واضح تصور یہ تھا کہ سرمایہ دارانہ معاشرہ نے سادہ لوح انسانوں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے لئے جال بنا ہے تاکہ مزدور ان سرمایہ داروں کی عیش کوشی کے لئے اپنا پسینہ بہائے، خدا، قدرت، تقدیر یہ سب اسی سرمایہ دارانہ سازش کے مفروضات ہیں۔ یہی وہ تصور تھا جس نے ترقی پسند ادب کا ڈھانچہ تیار ہوا تھا۔ افسانوں، نظموں، ڈراموں سے اسی تصور کی پرورش کی جاتی رہی اور جس نے اس کی مخالفت کی اس کو رجعت پسند، سرمایہ دار کا دلال کا فریب خوردہ، ناواقف، سادہ لوح وغیرہ وغیرہ کہا گیا۔ لیکن جس تیزی سے یہ غبار چڑھا تھا

اور ۱۹۳۰ سے ۱۹۵۰ تک جس درجہ سرسامی اور ہسٹریائی قسم کا جنون تھا وہ اس کے بعد کم ہونا شروع ہوگیا۔ اور بہت سے اشتراکیت زدہ ادیبوں میں اعتدال آنے لگا۔ اس اعتدال یا کمی کا سبب ان علاقوں میں کمیونزم کی ناکامی تھا۔ نیز روس سے بھاگے ہوئے ادباء اور ناول نگار، اور خود اسٹالین کی بیٹی جو ۱۹۵۳ء میں فرار ہوکر امریکہ پہونچ گئی تھی اس کے بیانات نے "آہنی حصار" کے اندر جو ہو رہا تھا اس سے دنیا کو روشناس کرایا۔ یہ سچ ہے کہ سوویت کو کسی فوجی شکست سے دوچار نہیں ہونا پڑا لیکن اس پر بھروسہ کرنے والوں کی مسلسل شکست خوردگی ضرور رنگ لائی جس نے کمیونزم کو ان لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعت کردیا جو اس سے آس لگائے بیٹھے تھے اور سمجھتے تھے امریکہ کے مقابلہ میں روس ان کی پشت پناہی کرے گا۔

مصر اور خاص طور پر جمال عبد الناصر کو اس سلسلہ میں جو ذلت و نامرادی اٹھانا پڑی اس سے دنیا واقف ہے اور اس کی تفصیل مرحوم انور السادات کی خود نوشت سوانح عمری البحث عن الذات میں موجود ہے۔ سوریا (شام) کے گولان پر اسرائیل نے جب قبضہ کیا اور دھمکی دی کہ جس وقت چاہیں آٹھ گھنٹوں کے اندر دمشق پر قبضہ کرسکتے ہیں۔ اس وقت بھی شام کا سب سے بڑا دوست روس ہی تھا۔ عراق و شام کو روسی کمیونزم کا عربی اڈیشن سمجھا جاتا ہے۔ ان ممالک کو سوائے زبانی ہمدردی LIP (لپ سروس) SERVICE کے کوئی عملی مدد نہ مل سکی۔ صرف افغانستان پر قبضہ باقی رکھنے کے لئے اس نے اپنی قوت کا مظاہرہ ضرور کیا مگر وہ بھی افغانیوں کے لئے نہیں بلکہ اپنے حدود کا رقبہ بڑھانے کی خاطر، افغانستان پر قبضہ کرنے کی مہم نے اس کو مشرقی ایشیا میں زیادہ عریاں کردیا۔ اور اس کا کھوکھلا پن ظاہر ہوگیا۔

آج جب دنیا بھر کے تبصرے اور جائزے سامنے آرہے ہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ بین الاقوامی سطح کے مدبرین یہ اعتراف کر رہے ہیں کہ بالشویک انقلاب خدا کے انکار سے شروع ضرور ہوا تھا مگر ختم اس کے اقرار پر ہوا جس نے اس وقت خدائی ہاتھ نہیں دیکھا تھا وہ اب دیکھ رہا ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے: إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا "بے شک باطل نابود ہونے والی چیز ہے۔"

اس قول کی صداقت تو اس طرح سامنے آگئی ہے کہ جو محروم بینائی و دیکھ نہیں سکتا وہ بھی محسوس کر معلوم کرسکتا ہے اور کمیونزم کو شجرۂ خبیثہ ہونا بھی اب کوئی راز نہیں رہا۔

لینن

(خدا کے حضور میں)

حکیم مشرق علامہ اقبالؒ کی یہ نظم اس مناسبت سے شائع کی جارہی ہے کہ لینن کو فنا ہوئے تو زمانہ گزر گیا اب وہ لعنت انسانیت کمیونزم بھی غارت ہوچکی جس کا وہ اپنے زمانہ میں ہیرو تھا۔ البتہ اس نظم میں ایک شعر "ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات" سے خیال گزرتا ہے کہ شاید وہ مزدوروں کا ہمدرد تھا۔ اور اس کو ان کی فکر تھی، علامہ اقبالؒ بھی اس پروپیگنڈہ سے متاثر تھے، حالانکہ جو حقائق اب کھل کر سامنے آگئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مزدور اور محنت کش عوام کی ہمدردی — صرف ایک سیاسی چال تھی، اور لینن نے اپنے دور ڈکٹیٹر شپ میں لاکھوں لاکھ مزدوروں اور محنت کش طبقہ کے افراد کو بے رحمی کے ساتھ قتل کیا تھا۔ ایک بات اور رہ گئی جو علامہ نے بیان نہیں کی کہ لینن خدا کے حضور میں گیا کیسے؟ یقیناً خذوہ فغلوہ ثم الجحیم صلوہ ثم فی سلسلة ذرعها سبعون ذراعا فاسلکوہ انہ کان لا یؤمن باللہ العظیم۔ کا عمل پیش آیا ہوگا۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بند شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالق اعصار و نگارندۂ آنات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سر شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

ومثل كلمة خبيثة كشجرة خبيثة اجتثت من فوق الأرض ما لها من قرار۔ اور ناپاک بات کی مثال ناپاک درخت کی سی ہے (نہ جڑ مستحکم نہ شاخیں بلند) زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جاتا ہے، اس کو ذرا بھی قرار (ثبات) نہیں۔

اس موقع پر اکبر الہ آبادیؒ کا یہ شعر بے اختیار یاد آرہا ہے۔

ہر چند شیخ جی کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

مسلمانان ہند کے لئے صحیح راہ عمل

ان کے منصب و مقام، اسلامی تعلیمات اور واقعات و حقائق کی روشنی میں

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

اس وقت ہندوستانی مسلمان جس سنگین اور نازک صورت حال سے دوچار ہیں اس سے متاثر اور پریشان ہوکر بعض لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت واضح کی جائے تاکہ مسلمان اس کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل متعین کرسکیں ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں مکمل طور پر نہ دار الحرب کا حکم لگتا ہے نہ دار الامن کا۔ لہٰذا ایسی صورت میں ہندوستانی مسلمان "خیر امت" کی حیثیت سے کیا رول ادا کریں۔ اس طرح کے سوال کے جواب کے لئے حضرت مولانا مدظلہ کا وہ فکر انگیز مقالہ پڑھئے جسے مولانا نے مارچ ۱۹۹۱ء میں بپاشنم پال گاندھی بھون حیدرآباد میں پیش کیا تھا۔ یہ فکر انگیز مقالہ وقت کی اہم آواز اور پکار ہے۔

ادارہ

الحمد للہ رب العلمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

حضرات! میں آپ کی عزت افزائی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس اہم اجلاس کے افتتاح کے لئے میرا انتخاب فرمایا، ایک حقیقت پسند انسان کے لئے جو اپنی حقیقت سے ناآشنا اور کسی فریب نفس میں مبتلا نہیں ہے، ان مواقع کی قدر و قیمت صرف اتنی ہی ہے کہ ان کے ذریعہ اس کو اپنے دل کی بات کہنے اور اپنے مطالعہ و تجربات کے نتائج کے اظہار کا ایک ایسی فضا میں موقعہ ملتا ہے، جس میں اس کی بات صبر و سکون اور اکثر اوقات ذوق و اشتیاق کے ساتھ سنی جاتی ہے، مجھے امید کرنی چاہئے کہ یہ پیش کش آپ کی طرف سے کوئی رسمی اعزاز نہیں ہے، بلکہ ایک اعتماد کا اظہار ہے، ہر چیز کی ابتداء بڑی نازک اور اہم ہوتی ہے، اور اس کا اثر اس کے پورے سلسلہ پر پڑتا ہے، خدا مجھے اس اعتماد و ذمہ داری کا اہل ثابت فرمائے۔

بزرگو اور عزیزو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور آپ کے لئے جس ماحول اور جن حالات کا انتخاب فرمایا ہے، اور اپنے علم و حکمت اور اپنے ارادہ و اختیار کی بنیاد پر انتخاب فرمایا ہے، وہ بہت اہم اور بہت نازک ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ماحول، یہ حالات، یہ سرزمین اور یہ عہد تو کسی بڑے مجدد کا طالب تھا، میں تاریخ اصلاح و تجدید کے نہ صرف طالب علم بلکہ ایک حقیر مصنف کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ جو عہد اور جو ماحول ہم کو آپ کو ملا ہے، جن مسائل سے ہمارا آپ کا واسطہ ہے، جن خطرات، جن اندیشوں اور جن چیلنجوں کا ہمیں سامنا کرنا ہے، اور اس زمانہ کے جن خفی لیکن بے رحم اشاروں کو سمجھنا ہے، وہ کسی بڑے مجدد کے، کسی صاحب عزیمت، صاحب حکمت اور مؤید من اللہ کے طالب ہیں، اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ یہ دور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے شایان شان تھا، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مجتہدانہ قابلیت اور مجددانہ عزیمت کے شایان شان تھا، یا شہیدین جلیلین، حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی حمیت و عزیمت اور بلند نظری و بلند حوصلگی کے شایان شان تھا، لیکن یہ دور، یہ مسائل اور یہ مشکلات ہمارے لئے منتخب کئے گئے "ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ"

لیکن ایک اچھے محنتی طالب علم کو اگر امتحان میں کوئی مشکل پرچہ ملے تو اگر اس نے محنت کی ہے، اس میں صلاحیت ہے، اور اس نے اپنی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق تیاری کی ہے تو اس کی شان یہ ہے کہ اس پر شکوہ نہ کرے، بلکہ شکر ادا کرے کہ وہ اس پرچہ کے قابل سمجھا گیا، اللہ تعالیٰ کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتا "وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ" وہ جو کچھ فیصلہ کرتا ہے، وہ اس کی قدرت کا بھی مظہر ہوتا ہے، اس کی حکمت کا بھی، اور اگر میں یہ کہوں کہ اس کی رحمت کا بھی مظہر ہوتا ہے تو بعید نہیں، اس کے اس فیصلہ میں (کہ اس نے ہم ناتوانوں کو ایسے عہد اور ایسی سرزمین کے لئے انتخاب کیا) اس کی قدرت کا ظہور بھی ہے، اس کی حکمت کا بھی ہے، اور میں یقین رکھتا ہوں کہ اس کی رحمت کا ظہور بھی ہے، حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آخر زمانہ ایسا ہوگا کہ تم جو کر رہے ہو اس کا عشر عشیر بھی اگر کوئی انجام دے گا تو اس کی نجات ہو جائے گی[1]، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم اس عہد سعادت میں ہوتے اور اس زمانہ میں کوئی عمل کرتے تو اس عمل کی اس زمانہ میں کوئی بڑی اہمیت اور نمایاں حیثیت نہ ہوتی، قیمتیں اپنے حالات اور اپنے ماحول کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی ہیں، بے موسم کا پھل بڑی قیمت میں بکتا ہے لیکن موسم کا پھل کوڑیوں کے مول بکتا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی بڑے حملے کے موقع پر دفاع کرنے والوں کے قدم اکھڑ رہے ہوں، اور جب سارے آثار شکست کے ہوں، اس وقت کوئی کمزور سپاہی، کوئی سن رسیدہ، کوئی بیمار مسلمان قدم جمائے کھڑا رہے تو اس کو جو اجر ملے گا غلبہ و فتح کے وقت بڑے سے بڑے شہسوار اور شہ زور کو نہیں ملے گا، تو کیا عجب کہ اللہ نے ہماری کمزوری، ہماری بے بضاعتی کے باوجود ہم کو جو ایسے پُر آشوب دور کے لئے منتخب فرمایا، یہ اس کی رحمت کا کرشمہ ہو، اس نے ہمیں ایک ایسا زمانہ دیا ہے کہ اس کے اندر تھوڑا کرنا اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت شمار ہوگا۔

حضرات! جہاں تک کسی ملک میں مسلمانوں کے رہنے، وہاں ان کی حیثیت اور ان کے فرائض منصبی کا سوال ہے تو تاریخ اسلام کے طویل سلسلہ اور فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں اس کے دو نمونے ملتے ہیں، پہلا نمونہ یہ ہے کہ مسلمان حاکمانہ حیثیت میں ہوں اور وہ ملک اسلامی حکومت کے زیر اقتدار ہو، جیسا کہ خلافت راشدہ کے بعد رومی و ایرانی شہنشاہیاں اور ان کے ممالک مسلمانوں کے زیر نگیں آئے، اور مسلمان جزیرۃ العرب سے لے کر مراکش تک پھیل گئے، انھوں نے افریقہ کی پوری شمالی مغربی پٹی فتح کرلی اور اس سے آگے سمندر کو عبور کرکے یورپ کے ملک اسپین پر قابض ہوگئے، اس حیثیت کے متعلق صریح احکام ہیں، قرآن مجید کے اشارات ہیں، ہدایات ہیں، صحابہ کرامؓ کا طرز عمل ہے اور عقل سلیم کا فیصلہ ہے کہ ایسے موقع پر مسلمانوں کا منصب کیا ہے، مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے، ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں، اور کس طرح ان کو زندگی گذارنی چاہئے، ان کے علماء کو کس طرح ملت کی قیادت کرنی چاہئے، ان کے داعیوں و مصلحین کی کیا ذمہ داریاں ہیں، ان کے علماء، فقہاء اور مفتیین کو مسائل کس ڈھنگ سے سلجھانے چاہئیں؟ اور ان کے مصنفین و مؤلفین و مفکرین کا طرز فکر اور اسلوب کیا ہونا چاہئے، یہ بات واضح ہے اور اس کے لئے پورا تاریخی رکارڈ موجود ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ مسلمان کسی جگہ مختصر و محدود اقلیت میں ہوں، وہ اس ملک کے حالات پر مطلقاً اثر انداز نہ ہو سکتے ہوں، ان کا ملک کے نظم و نسق میں کوئی حصہ نہ ہو، وہ خالص محکومانہ زندگی گذار رہے ہوں، اس کے لئے بھی کتابوں میں فقہ و شریعت کے احکام موجود ہیں۔

لیکن ہندوستان میں ہماری نوعیت اس وقت دونوں سے مختلف ہے اور وہ بڑی فکر انگیز، اجتہاد طلب، اعلیٰ ذہانت، حقیقت پسندی اور سخت جدوجہد کی طالب ہے، اور اس سے بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، یہاں ہم اقلیت میں تو ضرور ہیں، لیکن وہ اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اکثریت کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے، اور اس کو اقلیت کہنا صحیح نہیں، بلکہ اس کو "ملت" کہنا چاہئے، ہم یہاں کم سے کم پندرہ کروڑ کی تعداد میں ہیں[1]، بہت سی خالص اسلامی مملکتوں میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں نہیں ہیں، کوئی اسلامی ملک تیس لاکھ کا ہے، کوئی چالیس پچاس لاکھ کا، کوئی دو کروڑ کا ہے، کوئی چار پانچ کروڑ تک کا ہے، انڈونیشیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد ہے لیکن وہ بھی تیرہ اور ساڑھے تیرہ کروڑ سے زیادہ نہیں لیکن ہم یہاں پندرہ کروڑ یا اس سے زائد تعداد میں ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ ملک جمہوری (DEMOCRATIC STATE) ہے، اس ملک کی سیاست میں ہمارا حصہ ہے، اس ملک کی قانون سازی میں ہمارا حصہ ہے، ہمارے لئے یہاں پورا موقع ہے کہ ہم ملک کے انتظامیہ (ADMINISTRATION) کو نہ صرف یہ کہ متاثر کریں بلکہ اس کو نئی شکل دینے اور ملک کو بہتر سے بہتر انتظامیہ مہیا کرنے میں ممد و معاون بلکہ بعض اوقات فیصلہ کن ثابت ہوں، ہم پالنگ کا بھی کام کرسکتے ہیں اور اس ملک کی قانون سازی ہم کو نظر انداز کرکے رہ نہیں سکتی، اگر مسلمان اپنے شہری حقوق کا صحیح جرأت مندانہ آزادانہ استعمال کریں تو ایوان قانون ساز (PARLIAMENT) انتظامیہ (ADMINISTRATION) اور حکومت کرنے والی پارٹی (RULING PARTY) کسی طرح مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کرسکتی، وہ مسلمانوں سے مستغنی نہیں رہ سکتی اور مسلمان چاہیں تو اس پر انقلاب انگیز اثر ڈال سکتے ہیں اور اس کی ہیئت کذائی بدل سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اس ملک میں ہم تنہا وہ "ملت" ہیں جو خدا کا واضح پیغام رکھتی ہے، جو آخری آسمانی محفوظ کتاب کی حامل ہے، سیرت نبوی کی دولت اس کے پاس ہے، نوع انسانی کے لئے رحمت و ہدایت کا عظیم سرمایہ، اسوۂ نبوی، حیات صحابہ، اور مثالی و معیاری انسانوں کے کردار و عمل کا عظیم ذخیرہ (رکارڈ) موجود و محفوظ ہے، وہ اس سیرت اور طرز زندگی کا عملی مظاہرہ کرسکتے ہیں اور بھٹکتی ہوئی انسانیت کی ہدایت کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں، یہ وہ ملت ہے جس کے پاس ہر عہد میں کسی ڈوبتے ہوئے معاشرہ کو، کسی بجھتے ہوئے چراغ کو، کسی برباد ہوتے ہوئے ملک کو، کسی رو بزوال نہیں بلکہ جاں بلب ملک یا معاشرہ کو بچا لینے والا پیغام رہا ہے، اس نے پہلی اور دوسری صدی ہجری (ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی) میں رومی، ایرانی اور وسط ایشیا کے برسر اقتدار ترکستانی معاشرہ[2] (جو زیادہ دنوں تک باقی رہنے اور قیادت کرنے کی صلاحیت کھو چکا تھا اور جس کی ظاہری چمک دمک اور فربہی صحت و توانائی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ وہ ایک غیر طبعی فربہی اور متورم جسم کی علامت تھی) اور ساتویں آٹھویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں نیم وحشی اور خون آشام چینی و ترکی نسل کی تاتاری قوم کو ایک نیا دین و عقیدہ، مقصد زندگی، روحانیت، ترقی یافتہ تہذیب و ثقافت، جامع و مکمل معاشرتی، تمدنی و انتظامی قانون اور نو بنو علوم و آداب دے کر ایک نئی زندگی و توانائی، قیادت و رہنمائی کی صلاحیت اور عالمی پیمانہ کی افادیت و امتیاز عطا کیا، اور ان کو زندگی کی ایک نئی قسط عطا کردی، اور انھیں کی ایک شاخ عثمانی ترکوں کو جنھوں نے ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں اسلام قبول کیا، اور اسلام لاتے ہی ان میں بیداری، نئی زندگی اور حوصلہ مندی پیدا ہوئی، ایشیائے کوچک اور یورپ میں ایک بڑی سلطنت (سلطنت عثمانیہ) کا بانی بنا دیا، جس نے کچھ عرصہ کے بعد خلافت اسلامی کی ذمہ داری بھی سنبھال لی اور حرمین شریفین و مقامات مقدسہ کی محافظ و پاسبان اور شوکت و عظمت اسلامی کا

۱؎ جامع ترمذی ابواب الفتن عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

۱؎ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بارہ کروڑ سے پندرہ کروڑ تک بیان کی جاتی ہے اور اس کے قرائن و اسباب موجود ہیں، حکومت بھی ان کی تعداد دس کروڑ تک مانتی اور بیان کرتی ہے۔

۲؎ رومی ایرانی معاشرہ کی پستی اور اخلاقی و معنوی زوال کی تفصیل کے لئے حسب ذیل کتب کا مطالعہ کیا جائے

DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE (EDWARD GIBBON)

IRAN SOUS LES SASSANIDES BY A. CHRISTENSEN

"ایران بعہد ساسانیان" مترجم ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر اورینٹل کالج، لاہور

نشان بن گئی۔

یہ وہ ملت ہے جو ڈوبتے ہوئے سفینہ کو ساحل تک پہونچا سکتی ہے، اور کسی گرتے ہوئے معاشرہ کو جو زمین میں بالکل دھنس رہا اور دلدل میں پھنس رہا ہے، اور جو خودکشی و خودسوزی پر آمادہ ہے بچا سکتی ہے اس لئے کہ اس کے پاس وہ کتاب الٰہی ہے، اس کے پاس وہ اسوۂ نبوی ہے اس کے پاس وہ ایمان موجود ہے، جو اس کو خالص دولت پرست، طاقت پرست، اقتدار پرست اور مادہ پرست بننے سے روکتا ہے، یہ تنہا وہ ملت ہے جس کو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا یقین ہے، اس پر غفلت کے چاہے کیسے ہی اور کتنے ہی دبیز پردے پڑیں، اس پر خود فراموشی کے کتنے شدید دورے پڑیں، اس کے دلوں کے اندر اس بات کا شعور باقی ہے کہ اس کو خدا کے سامنے جانا ہے، اللہ کے رسول کو منہ دکھانا ہے، اور اپنی زندگی کا حساب کتاب پیش کرنا ہے، وہاں نہ عزت کام آئے گی نہ دولت، نہ طاقت کام آئے گی نہ اقتدار، نہ ذہانت کام آئے گی نہ علم، اگر کام آئے گا تو خدا کا خوف کام آئے گا، احساس فرض، سچی عبودیت اور بے لوث خدمتِ خلق کام آئے گی، ایمان اور عملِ صالح کام آئے گا۔

میرے محدود مطالعہ میں اس ملت کی حیات اور اس کے طویل سفر اور تجربوں میں یہ بالکل انوکھی مثال ہے کہ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں، ہم عظیم ترین اقلیت میں ہیں، یہ اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اگر وہ اپنی امتیازی صلاحیت کا ثبوت دے، اکثریت سے زیادہ محنت سے کام کرے اور اپنی اہلیت و افادیت، اپنے خلوص و صداقت کا مظاہرہ کرے تو وہ قیادت کا مقام بھی حاصل کر سکتی ہے، اور اگر یہ نہیں تو کم از کم ملک کا رخ تبدیل کر سکتی ہے، اور صاحبِ اقتدار جماعت کو اپنی ضرورت و افادیت تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتی ہے، پھر اس کے ساتھ اس میں حقیقی زندگی کی وہ رمق باقی ہے (میں اس کو زندگی کی رمق ہی کہوں گا) جو دنیا کی اکثر ملتیں کھو چکی ہیں، روحانی حیثیت سے، ایمانی حیثیت سے، اور احتساب نفس کے لحاظ سے وہ ملتیں اس آخری اخلاقی شعور اور ضمیر کی زندگی و بیداری سے محروم ہو چکی ہیں، جس کو زندگی کی رمق کہا جانا چاہئے، یہ ملت اپنی ساری کمزوریوں کے ساتھ اس رمق کی محافظ ہے۔

ایسی حالت میں اس ملت کے علماء کی علوم دینیہ کے اہل نظر و اہلِ فکر ماہرین کی، ملت کے بے لوث و بالغ نظر قائدین کی اس ملک، اس عہد اور اس ماحول میں ذمہ داری اتنی عظیم اور عظیم ہونے کے ساتھ اتنی نازک اور اتنی پیچیدہ ہے کہ اس کا تصور اس سے پہلے کسی ملک میں کرنا مشکل تھا، پندرہ کروڑ کی تعداد میں مسلمان ایک ایسے ملک میں موجود ہیں جو لرزہ خیز مصائب اور ہوش رُبا مسائل سے دوچار ہے، جہاں عرصہ سے انسان سازی کا، اخلاق و کردار کے بنانے اور ان کو توانائی بخشنے کا، دولت کی کشش اور مادیت کے سحر کا مقابلہ کرنے والی اخلاقی و روحانی طاقت پیدا کرنے کا کارخانہ بند ہو چکا ہے، اس کے جو بھی اسباب ہوں (ان اسباب کی اس مختصر مقالہ میں تشریح نہیں ہو سکتی) یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کا معاشرہ ایک اخلاقی بحران میں مبتلا ہے جس کے آثار و نشانات قومی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہیں۔

ایسی حالت میں ایک ملت یہاں رہتی ہے جو پندرہ کروڑ کی تعداد میں بتائی جاتی ہے وہ اپنے پاس اللہ کی کتاب صحیفۂ آسمانی رکھتی ہے، سنتِ نبوی مدوّن اور محفوظ طریقہ پر اس کے پاس ہے، فقہ اسلامی کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو زندگی کے تمام احکام (عبادات سے لے کر معاملات، سیاستِ مدن و اخلاق و اجتماع کے آداب تک) پر مشتمل ہے جس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں پائی جاتی، فقہ کا جتنا بڑا کام، اعمال اور انسانی زندگی کے توقعات کا، ثواب و عذاب کے عقیدہ اور ایمان سے اور انسانی حرکات و اعمال کا، حلال و حرام، جائز و ناجائز کے تصور سے جو ربط ہے، اس ربط کی تفسیر و تشریح کرنے کے سلسلہ میں جو محنت اسلام کی تاریخ میں ہوئی ہے اس کی کوئی مثال مجھے معلوم نہیں، اور جس کی کوئی نظیر گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔

حضرات! ہم ایک ایسے ملک میں ہیں جہاں اگرچہ ہم اصطلاحی طور پر اقلیت میں ہیں لیکن حقیقت میں پوری قوم ہیں، پوری ملت ہیں، اس کے ساتھ ایک تاریخ ہے، ہندوستان میں آٹھ سو برس تک اس نے حکومت کی ہے، اور کامیاب حکومت کی ہے، اس ملک کو بنایا ہے، سنوارا ہے، ملک کا نام دنیا میں روشن کیا ہے، اس نے ملک کو وہ چیز دی جس سے وہ عرصہ سے محروم ہو چکا تھا، اس میں پہلی مرتبہ سیاسی و انتظامی وحدت پیدا کی، اس کو مساوات و اخوتِ انسانی کا پیغام دیا، اور ہندوستان کو جو ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا ایک طویل و وسیع، مضبوط و مستحکم توانا و صحت مند انتظامیہ اور وسیع مرکزی حکومت عطا کی۔

اس کے بعد سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم آخری امت ہیں، ہم حاملِ قرآن ہیں، ہم داعی الی اللہ ہیں، ہم محتسبِ کائنات ہیں، اقبال نے ابلیس کی زبان سے یہ حقیقت ادا کروائی ہے، اس کے سامنے اس کی مجلسِ شوریٰ میں مختلف قوموں کے بارہ میں کہا گیا، اور مختلف خطروں کی نشاندہی کی گئی، اس کی مجلس کے ارکان نے کہا ہمارے نظام اور کام کو اشتراکیت سے خطرہ ہے، ملوکیت سے خطرہ ہے، جمہوریت سے خطرہ ہے، کسی نے کہا کہ ؎

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئے بار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس نے ان تمام خطروں کو کوئی اہمیت نہیں دی اس کے برخلاف اس نے کہا ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

اس نے کہا ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو

مسلمان قوم کا یہ امتیاز اور اس ملک کا جمہوری نظام، پھر مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی، یہ ساری باتیں مواقع فراہم کرتی ہیں کہ ہم یہاں کے نظم و نسق پر اثر انداز ہوں، یہاں قانون بنانے میں ہمارا حصہ ہو سکتا ہے، پھر اس ملک کے جمہوری ہونے کی وجہ سے اس ملک کی قیادت کا منصب بھی ہم حاصل کر سکتے ہیں، اگر ہم اپنے کو اخلاقی طور پر، باطنی طور پر، ذہنی طور پر بھی اور علمی طور پر بھی ممتاز و فائق ثابت کر دیں تو اس ملک کی قیادت کے ہم طالب نہیں ہوں گے، ملک کی قیادت خود ہماری طالب ہوگی، ہمیں سورج کا چراغ لے کر ڈھونڈھے گی، یہاں کی خاک کے ذرہ ذرہ، درخت کے پتہ پتہ سے آواز آئے گی کہ اس ملک کو بچانے والے کہاں ہیں؟ آئیں اور اس ملک کو بچائیں! آپ کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپ کو کچھ آسانیاں چاہئیں، کچھ آسامیاں چاہئیں، آپ ملک کے نجات دہندہ ہیں! آپ اس ملک کی آخری امید ہیں! اس ملک کے باشندوں کو ہم عدل کا پیغام دیں، عقلِ سلیم کا پیغام دیں، خدا ترسی اور انسان دوستی کا پیغام دیں، اور اس میں اس کا لحاظ رکھیں کہ ہمارا وہ پیغام ہمارے اسلامی عقیدہ اور ایمانی جذبہ کے ساتھ مربوط اور جڑا ہوا ہو، یہاں تک کہ ذہین لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص طرح کی قوتِ شامہ عطا فرمائی ہے، (جو معنویات میں بھی اسی طرح کام کرتی ہے جیسے مادیات و جسمانیات میں) اس عمومی انسانی دعوت میں ہمارے ایمان کی خوشبو اور مہک پائیں، وہ یہ محسوس کریں کہ یہ خود غرضی کا پیغام نہیں، نفسانیت کا پیغام نہیں، اس کے پیچھے سیاسی یا اقتصادی مقاصد نہیں، یہ وہ پیغام ہے جس کو ان لوگوں کے ایمان باللہ و تعلیماتِ اسلامی نے پیدا کیا اور جلا اور طاقت دی ہے، اس پیغام کا سرچشمہ اور اس کا محرک و داعی ان کا خدا ہے (جو رب العالمین ہے) اور خدا کے اس آخری رسول (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے (جو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے) رابطہ ہے۔

اگر ہم یہ کام کریں گے تو صرف یہی نہیں کہ ہم اس ملک میں عزت کے ساتھ رہ سکیں گے بلکہ اس ملک کی قیادت ہم کو تلاش کرے گی حضرت یوسف جیل گئے اور ایک ایسے الزام میں گئے جس کے بعد ایسے اسیرِ زنداں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا اور وہ آدمی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔

لیکن انھوں نے اپنے کردار سے، اپنی علمی صلاحیت سے، اپنی معجزانہ ایمانی طاقت سے، اپنی انسان دوستی سے جیل کے اندر رہ کر بھی یہ ثابت کر دیا کہ وہ مصر میں تنہا آدمی ہیں جن کے پاس ایمان ہے جن کے پاس کردار کا جوہر ہے، جن کے اندر علمی صلاحیت ہے، انسان دوستی کا جذبہ اور امانت و دیانت ہے، بالآخر بادشاہِ مصر ان کو جیل سے بلواتا ہے، لیکن وہ خودداری کے ساتھ کہتے ہیں "ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ"[1] (اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، بیشک میرا پروردگار ان کے مکر سے خوب واقف ہے) بادشاہ نے پھر تحقیق کی اور مدعیہ نے کہدیا "مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ"[2] (حاشا للہ! ہمیں اس میں کوئی برائی معلوم نہیں، اس کی کوئی خطا نہیں تھی، یہ سب میرا پھیلایا ہوا جال اور میری بنائی ہوئی سازش تھی، جب وہ نکلے تو بادشاہ نے پیش کش کی کہ آپ کوئی عہدہ قبول کیجئے، انھوں نے کہا "اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ"[3] (مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے، کیونکہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف ہوں) قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں جو حالات کی تفصیل بیان کرے، لیکن اس قصہ کے سیاق میں ہمیں یہ بات مضمر معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جنھوں نے سالہا سال مصر میں گزارے تھے سمجھ گئے کہ اس ملک اور انتظامیہ کا سب سے زیادہ کمزور شعبہ مالیات اور رسد کا شعبہ ہے اور یہ وہ شعبہ ہوتا ہے، جو عوام سے زیادہ سے زیادہ ربط رکھتا ہے، جس کے ذریعہ ہر جگہ عوام تک پہونچا جا سکتا ہے، اور ان کی بے لوث خدمت کر کے ان کو ممنون و متاثر اور ان کو صحیح عقائد اور واضح حقائق پر غور کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ انھوں نے کہا "اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ"۔

حضرات! ساری سیاسی پارٹیوں کی موجودگی میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی موجودگی میں اور تعلیم کا معیار جو اس وقت ہے اور اس کے جو وسائل اس ملک کو مہیا ہیں، ان سب کے باوجود صالح قیادت، عادل قیادت، خدا ترس قیادت اور انسان دوست قیادت کا منصب خالی ہے، آپ اپنی حیثیت پہچانیں، اپنا منصب جانیں اور ملک میں خدمت، ملک میں صالح انقلاب لانے اور ملک کو صحیح رُخ پر لگانے اور چلانے کی اپنی صلاحیت کو پہچانیں اور اس سے کام لیں۔

ہم کو ملک و ملت دونوں زندہ حقیقتوں میں سے کسی حقیقت سے آنکھیں نہیں بند کرنی چاہئے، البتہ ہماری داعیانہ حیثیت، ہماری بے لوث اور خدا اندیش فطرت اور ہمارا وہ فرض منصبی جس کی بنا پر ہم کو "خیر امت" کا لقب ملا، اس پر غالب رہنا چاہئے، اس سود و زیاں کی دنیا میں، اس قمار خانۂ سیاست میں ہماری اصول پسندی، ہمارا اخلاقی کردار اور ہمارا ایمانی شعار سب پر غالب رہنا چاہئے، ہمیں ان سیاسی پارٹیوں کی پست سطح پر کبھی نہیں آنا چاہئے جو دوسروں کی تخریب میں اپنی تعمیر اور دوسروں کی بربادی میں اپنی ترقی کا خواب دیکھتی ہیں، اور جن کا منتہائے نظر حکومت کی کرسیوں کے سوا کچھ نہیں، ہمیں اس ملک کے بارہ میں بھی اور اس ملت کے بارہ میں بھی اپنا ذہن نبوی و آسمانی تعلیمات کی اساس پر تعمیر کرنا چاہئے۔

حضرات! اس کے ساتھ ساتھ ہمارا فرض ہے کہ ہم مسلمانوں میں دینی شعور بیدار کریں، آپ کی ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں میں دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کریں، ہماری آئندہ نسلیں ارتداد کے خطرہ میں مبتلا ہیں، تہذیبی اور ذہنی ارتداد تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے لیکن اعتقادی ارتداد کا خطرہ بھی سر پر آ گیا ہے آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ قصبات میں، گاؤں میں، شہروں میں، محلوں میں، گھروں اور برادریوں میں، بچوں کو دینی تعلیم دینے کی ضرورت کا احساس پیدا کریں، مدارس اور مساجد قائم کریں، شبینہ اور صباحی مدارس و مکاتب قائم کر دیں، اور ان کا جال بچھا دیں، میں اس موقع پر

---

[1] سورۂ یوسف – ۵۰ [2] ایضاً – ۵۱ [3] ایضاً – ۵۵

اپنی ایک گزشتہ تقریر کا اقتباس پیش کروں گا جو میں نے کچھ عرصہ پہلے دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم پر کی تھی:-

"اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ ملت کے لئے صرف ایک پوسٹر بنانا ہے، اور صرف ایک جملہ کی گنجائش ہے، اور اس کے علاوہ کچھ نہیں، تو میں کہوں گا "مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي"[1] لکھ دو، پوسٹر کے نیچے لکھو کہ ہر مسلمان اپنی اولاد سے دنیا سے جانے سے پہلے سوال کرے اور جب تک دنیا میں ہے، اپنا جائزہ لے، محاسبہ کرے کہ اس کے نزدیک اس کی اہمیت ہے یا نہیں؟ وہ اپنے بچوں کے لئے اپنی آئندہ نسل کے لئے یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتا ہے یا نہیں کہ "مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي" (میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟)

میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اور آپ سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور یہ دیکھیں کہ واقعی اس سوال کی ہمارے یہاں اہمیت ہے یا نہیں؟ اور یہ سوال افراد کے پیمانہ پر، خاندان کے پیمانہ پر، برادری کے پیمانہ پر، معاشرہ کے پیمانہ پر، محلہ کے پیمانہ پر، قصبہ کے پیمانہ پر، اور آخر میں کہتا ہوں کہ ملت کے پیمانہ پر، اور ملت ہندیہ اسلامیہ کے پیمانہ پر، ہمارے دلوں پر نقش ہے یا نہیں؟ ہماری آئندہ نسل ہمارے بعد کس راستہ پر چلے گی، وہ کس گروہ و ملت کی پیرو ہوگی، کس کی پرستش کرے گی، کن عقائد کو مانے گی، یہ خدائے واحد کی پرستار ہوگی یا سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروروں خداؤں اور دیوتاؤں کی، یہ اس وسیع کائنات میں اور اپنی محدود زندگی میں کس کے دستِ قدرت کو کام کرتا ہوا دیکھے گی اور مانے گی؟[2]

اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کی جو جد و جہد شروع ہو گئی ہے، اس کو جاری رکھیں، ہم کو کسی ملک میں دریا کی مچھلیوں کی طرح (جن کی کوئی شناخت نہیں ہوتی) زندگی گزارنے کی اجازت نہیں، شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ نے پوری ملت کو جھنجھوڑ کر رکھدیا، اور اس کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے جو پہلے سے قائم تھا اس کو اپنا موضوع بنایا، پھر یکساں سول کوڈ کا مسئلہ ہے، ان سب مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، یہاں بھی میں اپنی ایک گزشتہ تقریر کا کچھ حصہ پیش کروں گا جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس بمبئی منعقدہ ۱۵، ۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء میں کی گئی، میں نے کہا تھا:-

"مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کر لیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظامِ معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے اپنے سارے شوقِ عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں اپنے عائلی و خاندانی روابط و تعلقات میں مسلمان نہیں حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں، اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظامِ معاشرت، نظامِ تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوتِ ارتداد کا مقابلہ کیا جانا چاہئے اور یہ ہمارا شہری جمہوری اور دینی حق ہے اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہارِ خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون و اطمینان میں مضمر ہے۔"[3]

حضرات! میں نے چند سال ہوئے اندور میں ٹیگور ہال میں پیامِ انسانیت پر تقریر کی، اس موقع پر R.S.S. کے لوگ اور دوسری جماعتوں کے لوگ موجود تھے، اگلے دن ایک وفد میری قیام گاہ پر آیا مجھے معلوم ہوا کہ اس میں R.S.S. کے لیڈر اور اس کے ذمہ دار ہیں، اور مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے مجھ سے کہا کہ "کل آپ کی تقریر سن کر ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ آپ کو اس ملک کی ہم سے زیادہ فکر ہے" میں اس تاثر اور شہادت کو اپنے ہی لئے نہیں پوری ملت اسلامیہ کے لئے ایک بڑا اعتراف اور قابلِ فخر نہیں تو قابلِ شکر سمجھتا ہوں، ضرورت ہے کہ آپ کی ہر بات سے اس کا اظہار ہو اور یہاں کے شہری یہ سمجھیں کہ آپ کو اس ملک کی ان سے زیادہ فکر ہے، آپ کو دولت سے زیادہ ملک عزیز ہے، آپ کو یہ معاشرہ عزیز ہے، لوگوں کا عزت کے ساتھ، سکون کے ساتھ، امن و امان کے ساتھ رہنا آپ کو دولت کمانے سے زیادہ عزیز ہے، یہ وہ جوہر ہے جو مفقود ہوتا جا رہا ہے، اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ لوگوں میں بھی یہ بات نہیں رہی، وہ بے تکلف اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے اس سطح پر آ جاتے ہیں، اور وہ کام کر لیتے ہیں جس سے ملک خطرہ میں پڑ جاتا ہے، معاشرہ بُری طرح زوال کا شکار ہوتا جا رہا ہے، اور پوری پوری کمیونٹی بلکہ ملک کی اس عظیم آبادی میں اس صورتِ حال پر حقیقی طور پر مضطرب و بے چین ہونے والا، اور اپنی کمیونٹی، پارٹی، فرقہ اور جماعت کی ملامت و تنقید یا مدح و تعریف سے بے پرواہ و بے نیاز ہو کر تنقید و احتساب کا فرض ادا کرنے والا اور خطرہ کا بگل بجانے والا دور دور نظر نہیں آتا۔

حضرات! آپ کے اس اجلاس میں بڑے بڑے علماء و فضلاء، علومِ دینیہ، زعماء و قائدین، اہلِ قلم و مفکرین موجود ہیں میں اپنی اس گزارش کو اسلام کے عہد اول کے ایک عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ کو یاد دلانے پر ختم کرتا ہوں جو ہمارے لئے پورا پیام رکھتا ہے۔

جس وقت جزیرۃ العرب میں ارتداد کی آگ پھیل گئی تو یہ سب کی ذمہ داری تھی لیکن ذمہ داری کے احساس میں فرق ہوتا ہے یہی فرق آدمی کو بڑا اور زندۂ جاوید بناتا ہے ابوبکر صدیقؓ اس وقت خلیفۂ وقت تھے انھوں نے کہا "أينقص الدين وأنا حي" (کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت ہو سکتی ہے؟ کوئی قطع برید ہو سکتی ہے؟) حیف ہے میری زندگی پر اگر میرے سامنے شریعتِ اسلامی میں ترمیم ہونے لگے اور اس کے فرائض و احکام میں انتخاب کیا جانے لگے کہ نماز تو ٹھیک، حج بھی ٹھیک، روزہ بھی ٹھیک، لیکن زکوٰۃ نہیں یا زکوٰۃ بھی ٹھیک روزہ نہیں، میں زندہ ہوں اور میرے سامنے یہ ترمیم ہو! یہ ہو نہیں سکتا!

بس یہ حمیت تھی جو اہل کران کی زبان پر آئی، اور یہ لفظ ان کی زبان سے نکلے اور اس نے زمانہ کی کلائی موڑ دی، اور تاریخ کا دھارا بدل دیا، ایک انسان کی حمیتِ اسلامی، ایک انسان کے احساسِ ذمہ داری نے تہہ بہ تہہ مشکلات کو کائی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا، تاریخ لمبی ہے اور واقعۂ ارتداد اور اس کی تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں لیکن حقیقت میں جو فیصلہ کن بات تھی وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بات تھی "یہ نہیں ہو سکتا میں زندہ ہوں اور دین پر حرف آئے" میں نے جو دین رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پایا تھا، وہ دین بے کم و کاست منتقل ہوگا، ایک نقطہ کو بھی میں اپنی جگہ سے مٹنے نہیں دوں گا، اور انھوں نے کر کے دکھا دیا، اور آج اسلام اپنی پوری شریعت اپنے ارکان و فرائض اور اپنے مکمل ڈھانچہ کے ساتھ موجود ہے۔

عہد حاضر بھی اس وقت کے علماء و قائدین اور سچے اور وفادار حاملینِ دین سے اسی دینی غیرت و حمیت اور اسی ہمت و عزیمت کا متوقع و منتظر ہے اور مستقبل کا مؤرخ ہی نہیں عہدِ حاضر کا حقیقت نگار اور وقائع نویس بھی گوش بر آواز ہے کہ وہ ہماری زبان (صرف زبانِ قال نہیں زبانِ حال) سے یہ اعلان سنے کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم[4]

---

[1] تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ یہ وہ سوال ہے جو حضرت یعقوبؑ نے اس دنیا سے رحلت کے وقت اپنی اولاد اور پسماندگان سے کیا تھا، ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ – ۱۳۳

[2] ماخوذ از خطبۂ صدارت علاقائی دینی تعلیمی کانفرنس الٰہ آباد منعقدہ ۱۷ فروری ۱۹۸۵ء، مشمولہ رسالہ "آئندہ نسلوں کے اسلام کی ضمانت اور ایمان کی حفاظت کی ذمہ داری" شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ صـ ۲۲–۲۳۔

[3] خطبۂ صدارت اجلاس ہشتم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بمبئی منعقدہ ۱۵، ۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء۔ صـ ۲۳–۲۴

[4] ہر کانٹے کے سرے کو ہم نے خونِ دل سے رنگین کیا ہے اور اس طرح صحرا و چمن کی باغبانی و بیابانی کا قانون (روشنائی سے کاغذ پر نہیں، بلکہ خونِ دل کی سرخی سے تحریر کیا ہے۔

بقیہ عالمِ اسلام

دراصل یہ سب کتابیں اور مخطوطاتِ عثمانی سلاطین کی ملکیت ہیں جو سلاطین کے حضور میں مصنفوں نے بطور نذرانہ پیش کی ہیں۔ اس کتبخانہ کے مصارف اس کی اپنی وقف کی جائداد کو پورے ہوتے ہیں اور حکومت بھی تعاون کرتی ہے۔

۱۴ ویں عالمی مقابلہ قراءت اور اس کی تیاری:

کچھ دنوں قبل حکومت سعودیہ عربیہ کے وزارتِ حج و اوقاف نے مکۃ المکرمہ میں مقابلہ قرأت و تجوید و تفسیر کا جلسہ منعقد کرایا تھا۔

جس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد ایک سو سے متجاوز تھی ان شرکاء کا تعلق ملک کے مختلف مدرسوں اور یونیورسٹیوں سے تھا۔

دراصل اس مقابلہ کی حیثیت ایک تمہیدی مقابلہ کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ۲۱ رجب کو منعقد ہونے والے ۱۴ ویں عالمی مقابلۂ قراءت (جو پانچ طبقوں پر مشتمل ہے) کے ہر طبقے کے لئے ایک ایک فرد کا انتخاب کر لیا جائے تاکہ عالمی مقابلہ میں ان کی شرکت سے مملکت سعودیہ عربیہ کی صحیح نمائندگی ہو سکے۔

جس میں مختلف اسلامی ملکوں اور مسلم اقلیتوں کے مدرسوں اور دینی اداروں کے شرکاء شرکت کریں گے۔ اس مقابلہ کو پانچ طبقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

۱۔ پہلے طبقہ میں مکمل حفظِ قرآن کے ساتھ گیارہ پارے کی تلاوت و تجوید و تفسیر دوسرے طبقہ میں مکمل حفظِ قرآن کے ساتھ تجوید و تلاوت، تیسرے طبقہ میں بیس پارے حفظ قرآن کے ساتھ تلاوت و تجوید، چوتھے طبقہ میں دس پارے حفظ کے ساتھ تلاوت و تجوید۔ پانچویں طبقہ میں۔ خوش الحانی کے ساتھ ایک پارہ حفظ لازمی ہے۔

اس میں شرکت کرنے والوں کی آمد و رفت کی سہولیات، طعام و قیام کے مناسب بندوبست کے ساتھ نابینا شرکاء کے رفقاء اور چھوٹے بچوں کے اولیاء کی ذمہ داری بھی وزارتِ حج و اوقاف ہی پر ہے

اس مقابلہ کے ذریعہ مسلم نوجوانوں کو قرآن مجید کی طرف ذہنی و جسمانی روحانی فکری ہر اعتبار متوجہ کرنا مقصود ہے تاکہ ان میں قرأت و تجوید کے شغف کے ساتھ ذوقِ تدبر پیدا ہو سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس مقابلہ سے مقصد میں بہتر کامیابی ہو رہی ہے

خوش مزاجی کا اثر معاشرہ پر

ڈاکٹر میر محبوب حسین
شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی

ڈاکٹر میر محبوب حسین کا یہ مضمون نہایت مفید ہے اس کو غور سے پڑھا جائے اور اپنے کو اس میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو گھر خاندان اور سماج کی بہت سی تلخیاں از خود ختم ہوجائیں بلکہ پیدا ہی کم سے کم ہوں افادۂ عام کے لئے ہم اس کو ہدیۂ ناظرین کررہے ہیں۔ (ادارہ)

لوگوں کے میل ملاپ سے معاشرہ بنتا ہے اس میل ملاپ کے لئے کچھ مستحکم اصول اور کچھ اچھے طریقوں کی ضرورت پڑتی ہے یہ اصول اور یہ طریقے جتنے اچھے اور جتنے پائیدار ہوں گے معاشرہ بھی اتنا ہی مضبوط اور اچھا ہوگا ہر شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ اسے زندگی گزارنا پڑتا ہے ان کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے رہیں، گھر میں ہو یا گھر سے باہر دوست احباب، بازار، دفتر، کارخانہ جہاں بھی وہ رہتا ہے ان سے اچھے تعلقات کا خواہشمند رہتا ہے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیے اپنے اندر کچھ صفات پیدا کرنے پڑتے ہیں، جیسے خیرخواہی، ایثار، عدل و انصاف، احسان، صلہ رحمی، درگزر، اعتراف خطا، باہمی اعتماد، حقوق کی ادائیگی، عیادت، سلام وغیرہ۔ بعض چیزیں تعلقات کو خراب کرنے والی ہوتی ہیں ان سے بچنے کی ضرورت ہے جیسے تجسس، غیبت بدگمانی، مذاق اڑانا وغیرہ۔

جو چیزیں اختیار کرنے کی ہیں ان میں ایک عمدہ صفت خوش مزاجی بھی ہے، خوش مزاجی کی ضرورت اس کے فوائد اور اس فن کو اپنانے کے لئے کیا چیزیں لازمی ہیں، ان سب کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے زندگی کے بارے میں کچھ اہم باتیں پیش کرنا ضروری ہے۔ زندگی ایک عظیم نعمت ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے مقتضیات اور تقاضوں سے آگہی حاصل کی جائے اور زندگی کے اعلی اصولوں کو اپنا کر کامیابی حاصل کی جائے زندگی میں خوشی و غمی دونوں ہیں۔ زندگی میں ناہمواری سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ مصائب، کشمکش، بدنصیبی اور ناکامی سے انھیں دوچار ہوتی ہیں، مشکلات اور دشواریاں بڑے آدمی کو بھی پیش آتی ہیں یہ مشکلات ان کو اس وقت جھنجھوڑتی ہیں جبکہ ان کی فکر تو تیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں چقماق سے رگڑ کی وجہ سے چنگاریاں اڑنے لگتی ہیں۔ اسی طرح ذہین طبیعتوں کو مشکلات سے تصادم کی ضرورت پڑتا ہے۔ اس سے ان کی فکری صلاحیتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ بار آور اور پختہ ہونے لگتی ہیں۔ ناکامی کامیابی کا زینہ ہوتی ہے۔ اہل فہم ان ناکامیوں کے بعد ہی کمر ہمت مضبوطی سے کستے اور زیادہ دانائی سے کام لیتے ہیں ان ہی ناکامیوں سے سبق لے کر وہ آئندہ کامیاب ہوتے ہیں۔ ملٹن نے تمام ادبی شہ پارے اس دور کی تصنیف کیا جبکہ وہ تنگدستی، مرض، ضعیفی اور اندھے پن کا شکار تھا۔

زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے بعد آئیے دیکھیں کہ انسان کی زندگی میں خوش مزاجی کا کیا رول ہے خوش مزاج انسان دلشاد، شاداں، مسرور، ہنس مکھ، نیک طینت، اچھی طرح گذر اوقات کرنے والا، مزے سے زندگی بسر کرنے والا، ——— خوش طبع، زندہ دل، ظریف، بامذاق جو ہر وقت خوش رہے ہشاش بشاش، خوش خلق، اچھی خصلت والا، خلیق، خندہ رو، خوش خصال، صاحب اخلاق بامروت، مہذب، باسلیقہ ہوتا ہے خوش مزاجی کا حامل شخص خود بھی خوش و خرم رہتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی خوش رکھتا ہے۔ معاشرہ میں انبساط اور مسرت کی فضاء قائم رہتی ہے، غم غلط ہوجاتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کا دل خوش کرنے کے لئے کبھی کبھی خوش طبعی بھی فرمایا کرتے اور اس میں بھی بات سچ ہی کہتے وہ ایک مثالیں پیش ہیں ایک روز کوئی ضعیفہ سرکار دو عالم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا: "یارسول اللہ دعا کیجئے میں جنت میں جاؤں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔" وہ بڑی پریشان ہوئی اور رونے لگی۔ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت میں بوڑھی عورتیں نہیں جائیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ جوان کرکے داخل کریں گے۔" اس پر وہ بڑھیا خوش ہوگئی ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ انہیں کوئی سواری کا جانور عطا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہم تجھے اونٹنی کا بچہ دیں گے۔" اس نے کہا "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اونٹنی کے بچہ کو کیا کروں گا؟ کیوں کہ سواری کے لئے بچہ تو کام نہیں دے سکتا۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اونٹ کو اونٹنی ہی تو جنتی ہے" ایک دن ایک شخص سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ: "بتاؤ کہ تمہارے ماموں کی بہن تمہاری کیا لگی۔" اس سادہ دل نے سر جھکایا اور سوچنے لگا۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے اور فرمایا کہ "ہوش کر، تجھے تیری ماں یاد نہیں رہی۔" رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز صحابہ کرام کے ساتھ کھجوریں کھارہے تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تشریف رکھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر حاضرین کھجوریں کھا کھا کر گٹھلیوں کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے آگے رکھتے جارہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزاحاً فرمایا کہ "گٹھلیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ کھجوریں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھائی ہیں۔" حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا "دیکھنے والا یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ میں نے گٹھلیاں چھوڑ دی ہیں جن کے سامنے گٹھلیاں نہیں ہیں وہ شاید مع گٹھلیوں کے کھا گئے ہیں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کرام اس حاضر جوابی سے بہت لطف اندوز ہوئے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے سواری کی خواہش کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں ہی تمہارا اونٹ بننے کو تیار ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کاندھوں پر اٹھالیا۔ اور حجرے کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک لے گئے اسی دوران امام عالی مقام نے فرمایا کہ اونٹ کی تو مہار ہوتی ہے جب کہ میرے اونٹ کی مہار کوئی نہیں۔" اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گیسوان کے ہاتھ میں دیئے کہ یہ مہار ہے اس حالت میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لے آئے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بھئی تمھیں سواری خوب ملی ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "سوار بھی تو خوب ہے" نبی علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے لطیف اور پاکیزہ مذاق سے محظوظ ہوتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوتے تو زیر لب تبسم فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح شگفتگی، شائستگی اور پاکیزگی کے حامل تھے اس سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی۔

کیجئے! اب دیکھیں خوش مزاجی سے کیا فائدہ حاصل ہوتے ہیں۔ خوش مزاج لوگوں کے پاس بیٹھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے موسم گرما میں کوہستان کی ٹھنڈی ہوا ہمیں تازہ قوت بخش رہی ہے یا موسم سرما میں سورج کی شعاعیں جسم میں حرارت پیدا کررہی ہیں۔ دراصل زندگی اپنے بنانے سے بنتی ہے بشاش طبع دنیا کو اپنے لئے

جنت بنالیتا ہے اور غمگین طبیعت اسی دنیا کو اپنے لئے جہنم کرلیتا ہے۔ خوش مزاج لوگ ہر چیز میں خوبی کا پہلو نکال لیتے ہیں، کتنا ہی بڑا حادثہ ہو وہ اس میں خوبی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ کتنا ہی بڑا حادثہ ہو وہ اس میں سے راحت و تسکین کا جزو الگ کرلیتے ہیں، آسمان کیسا ہی دھواں دار ہو وہ کسی نہ کسی گوشہ سے سورج کی کرن کا کھوج لگا لیتے ہیں اور اگر سورج ان کی نگاہوں سے بالکل ہی چھپا ہو تب بھی وہ مطمئن رہتے ہیں کہ سورج موجود ہے اور کسی حکمت یا مصلحت سے غائب ہے کوئی بار اٹھانا پڑتا ہے تو وہ نہایت بشاشت سے اٹھاتے ہیں نہ جھنجھلاتے ہیں نہ گھبراتے ہیں نہ فضول آہ و زاری سے اپنا دماغ پریشان کرتے ہیں بلکہ ہمت سے آگے بڑھتے اور اس طرح پھول چنتے ہیں گویا وہ ان کے راستہ ہی میں پڑتے ہیں جو لوگ وسیع القلب و عظیم الفطرت ہوتے ہیں وہ عموماً زندہ دل پرامید اور تجربے سچے ہوتے ہیں۔ ہر حادثہ میں وہ بھلائی کی توقع رکھتے ہیں۔ مرض میں اعادۂ صحت کے منتظر رہتے ہیں کشمکش میں اصلاح و ترتیب پر نظر رکھتے ہیں مصائب میں ہمت۔ تجربہ اور علم کے سبق سیکھتے ہیں۔ امید قدرت کی نعمت ہے، غریب کی مددگار ہے، اسی تحریک پر دنیا میں بڑے بڑے کام ہوتے ہیں، خوش مزاجی، خوش طبعی اور شیریں کلامی کے نتیجہ میں مخاطب اور متکلم دونوں سے شیریں حرکات صادر ہوتی ہیں اس کی عادت پڑجاتی ہے، یہ ممکن ہے کہ حسن سلوک کا جواب ناسپاس گزاری کی صورت میں ملے لیکن کسی کی ناشکری سے محسن روحانی مسرت سے محروم نہیں ہوسکتا۔ اس سے اخلاق و مروت کی تخم ریزی کی جاسکتی ہے ان میں سے کوئی نہ کوئی تخم تو اچھی زمین میں جگہ پاکر محبت کا پھل پیدا کرے گا۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ دوزخ کی آگ ہر ایسے شخص پر حرام ہے جو مزاج کا تیز نہ ہو، نرم خو ہو، اور لوگوں کے قریب ہونے والا ہو۔ مہاتما گاندھی کہتے ہیں: "ہنسی من کی گرہوں کو بڑی آسانی سے کھول دیتی ہے میرے من کی ہی نہیں، تمہارے اور سب کے من کی بھی۔" گسٹے کہتا ہے: "برتاؤ ایک آئینہ ہے جس پر ہر شخص اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں خوش مزاجی ایک بہترین جوہر ثابت ہوتی ہے غصہ کی ساری آگ نرم جواب کی پھونک سے سرد ہوجاتی ہے"۔ برنس شاعر نے اچھی بیوی کی خصوصیات کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے اس میں سے چار حصے خوش مزاجی کے ہیں دو خوش فہمی کے، ایک لطیف ظرافت کا، ایک حسن کا اور دو حصے دیگر چیزوں کے مثلاً تعلیم، خاندان وغیرہ۔ حسن صورت عمر کے ساتھ کم ہوتا جاتا ہے لیکن حسن سیرت بڑھتا رہتا ہے۔

خوش مزاجی ایک فن ہے۔ غمگین لوگ زندگی کو مغموم اور خوش مزاج زندگی کو پربہار بنا لیتے ہیں۔ کوئی دل کی دنیا میں بادشاہ اور کوئی غلام، زندگی اپنی انفرادیت کا آئینہ ہے اچھوں کے لئے دنیا اچھی اور بروں کے لئے یہی دنیا بری ہے۔ خوش باشی بلند نظری اور خدمت خلق کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ دنیا مسرت آگیں، امید افزا اور بابرکت بن جائے گی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری فکر و پریشانی ہمارے ہی تخیل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مسرت و خوشی خصوصاً سلامتی طبع، صبر و تحمل اور ملنے والوں سے نرمی اور دلجوئی کے برتاؤ پر منحصر ہے۔ افلاطون کا قول ہے کہ: "دوسروں کی بھلائی سے اپنا بھلا ہوتا ہے"۔ خاکساری اور تواضع، نرمی، حلم و بردباری، عفو و درگذر، انکساری، دوسروں کا لحاظ، دوسروں کی عزت، دوسروں کی رائے کا احترام، تحمل، خوش کلامی، محبت، نرم گفتاری، مسکراہٹ وغیرہ خوش مزاجی کے لئے ضروری ہیں اور جن چیزوں سے بچنا ہے ان میں سختی سے بات کرنا، ترش روئی سے جواب دینا، بات کرتے وقت پیشانی پر بل ڈال لینا، طعن، تشنیع، دل دکھانے والی بات اور حقارت آمیز الفاظ سے خطاب کرنا۔ اپنی برتری ظاہر کرنا، ایذا رسانی، بدکلامی، بدگوئی نفرت، حسد، نفاق، خودغرضی، عیش پرستی قسمت سے شاکی رہنا، غصہ، دنیا کی بے ثباتی سے غافل رہنا، خدا کی خوشنودی ملحوظ نہ رکھنا شکوہ، شکایت، غیبت، حرص، لالچ، طمع وغیرہ سے بچنا چاہئے، دوستی کے آغاز کے ضمن میں دوسروں کا انتظار کئے بغیر آپ ہی سب سے پہلے آغاز کیجئے۔ آپ کی یہ کوشش حقیقتاً کامیاب ہوگی۔ اگر ہم تہیہ کرلیں کہ جو کچھ بھی ہم کریں گے اس سے لطف اندوز ہوں گے تو یہ ہوسکتا ہے اس سلسلہ میں ہم بچوں سے سیکھ سکتے ہیں ایک بچہ بہتہ گھومنے سے پیدا ہونے والی آواز سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ بلیک بورڈ پر چاک کی رگڑ، نہاتے وقت جسم پر صابن کی ملائم پھسلن سے خوش ہوتا ہے، دروازے پر لگے ہوئے پیتل کے ہینڈل کے چکنے پن اور اسے گھمانے سے پیدا ہونے والی آواز کا مشاہدہ کرکے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ خوشی ازدواجی زندگی بسر کرنی ہے تو اپنے تمام اختلافات روز کے روز ختم کرلینے چاہئیں۔ اندر جیت لال نے اپنی نو برس کی لڑکی ریٹا کے متعلق لکھا ہے ایک دن وہ اپنی ماں سے کہہ رہی تھی کہ ماں! کیا میں اپنی سہیلی نینا کو رات کے کھانے پر بلاؤں؟ اس کی ماں نے کہا، "لیکن کل تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہاری نینا سے کٹی ہے۔ تمھیں اس سے نفرت ہے"۔ اس پر بچی نے کہا وہ قابل غور ہے۔ "وہ کہتی ہے وہ تو میں کل کہہ رہی تھی نا! تم سمجھتیں کیوں نہیں

تھی۔ خوش مزاجی ہر امیر و غریب کے لئے یکساں ممکن ہے۔

آخر میں خوش مزاجی کے تعلق سے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

اقبال کہتے ہیں:

خوش مزاجی سا زمانہ میں کوئی جادو نہیں
ہر کوئی تمھیں کہے ایسی طبیعت چاہیئے
ہنس کے ملنا رام کرلیتا ہے ہر انسان کو
سب سے میٹھا بولنے کی تم کو عادت چاہیئے
یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

ناسخ کہتے ہیں:

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

سلیم پانی پتی کو دیکھئے:

وہ طبیعت مردہ ہے پژمردہ ہے جس میں رہو
تازگی جو سبزہ میں ہے یا گل شاداب میں
اور اس میں جو احتیاط ملحوظ رکھنی ہے وہ بھی سن لیجئے
خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

(بشکریہ "شاداب" حیدرآباد)

بقیہ
پروپیگنڈہ اور نفسیاتی جنگ

یہ اسلوب جھوٹ، تحریف، حذف و اضافہ کو شامل ہے، اس طرز کی واضح مثال، "جی وی مولیہ" کا مصر پر حملہ کے دوران اعلان کہ فرانسیسی فوج "اسماعیلیہ شہر" پر پوری طرح قابض ہوگئی ہے لیکن فرانسیسیوں نے اس اعلان کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد اس خبر کی تکذیب کردی۔

● ترانوں اور گانوں کا اسلوب:

یہ اسلوب اعلان جہاد اور نصرت مظلوم میں بہت ہی عمدہ اور موثر ہے اس شرط پر کہ گانے زمانہ کے ضعیف الرائے حضرات کے استدلال و قیاس سے خالی ہوں۔ اس اسلوب کی مثال "واللہ اکبر فوق کید المعتدی" کا نغمہ جانفزا ہے

● بھڑکیلے نعروں کا اسلوب:

امت اسلامیہ اس سے بہت زیادہ دوچار ہوتی ہے۔ اس کا مقصد اصلی، بزدل رہنما کے دھمکی آمیز اعلانات، بیانات اور اس کی طاقتوں کو دہرانا ہے، نیز وحدت، ترقی، تمدن اور عوام جیسے الفاظ کی تکرار ہے جیسے یہ کہا گیا کہ فلسطین کی آزادی کے لئے "آسٹریلیا" "چیکوسلاویہ" کی آزادی ضروری ہے، البتہ اگر قرآن، سنت اور سلف صالحین کے منقول اقوال ہوں تو یہ علامات و رسوم، تمام علامات اور پروپیگنڈوں سے زیادہ منفعت بخش ثابت ہوں گی۔

● جوابی پروپیگنڈہ:

یہاں ہم اسلام کے جوابی پروپیگنڈہ کا ذکر کریں گے۔ یہ پروپیگنڈہ بین الاقوامی سازش کے مقابلہ میں مادی ٹیکنیک سے مسلح ہے۔ پروپیگنڈہ باز حضرات، گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں، اور بسا اوقات حقائق و واقعات سے متعلق اپنے اوراق اور اپنی نوشتہ تحریریں نذر آتش کرڈالتے ہیں پھر کف افسوس ملتے ہیں اسلام کے جوابی پروپیگنڈہ کے مخاطب حقیقت، صداقت، اور ابدیت کے علمبردار دین اسلام کے خوددار اور غیور مسلمان ہیں، ہم مسلمان جوابی پروپیگنڈہ کو اپنے حق میں مندرجہ ذیل امور کی روشنی میں موثر اور سودمند بنا سکتے ہیں۔

● جوابی پروپیگنڈہ کی کامیابی کی پہلی شرط کتاب و سنت کی طرف واپسی اور ان سے مستفاد بنیادوں پر کامل اعتماد و توکل ہے

● دشمن کے پروپیگنڈوں کو دین و شریعت کے ترازو میں تول کر اس کے اہم عناصر ترکیبی کا تجزیہ کرنا، تاکہ وہ تحلیل ہوجائے یا اس کی حقیقت واضح ہوجائے۔

● دشمن کے پروپیگنڈہ مفاہیم و مطالب کی نقشہ آرائی، نیز ان مطالب کے مرکزی مفہوم کا مطالعہ کرنا تاکہ اجزاء کا معمولی محنت کم وقت میں مقابلہ کیا جاسکے، اس کی مثال حرمین شریفین پر قبضہ کا مسئلہ ہے جس کو عراقی میڈیا نے بار بار پیش کیا، نیز آزادی فلسطین کا مسئلہ، جس کے پیچھے بعض اپنے بھائی اپنا چہرہ چھپائے ہوئے ہیں۔

● دشمن کے پروپیگنڈہ کی مہم میں کمزور پہلوؤں کو تلاش کرنے کے بعد اولاً سب سے کمزور حلقہ پر وار کرنا اور اسی طرح دوسرے پہلوؤں پر

● دشمن کے پروپیگنڈہ کے براہ راست ٹکراؤ سے بچنا اس لئے کہ اس سے دشمن کو تقویت پہونچے گی۔

● دشمن کے پروپیگنڈہ کے لئے ناساز گار ماحول پیدا کرنے کی سعی کرنا، یہاں تک کہ ذرائع ابلاغ خصوصاً اخبارات، جرائد، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ پر اس کا ذرا سا بھی اثر نہ ہو۔

بقیہ
کل ہند پیام انسانیت

کرب کو بغیر کسی واسطہ کے پیش کیا جاتا لیکن افسوس کہ ایسا نہیں کرسکے، ورنہ دل کھول کر دکھایا جاتا۔ اور دل کے آئینہ میں انسانیت کی جھلسی ہوئی تصویر آپ دیکھ لیتے۔

حضرات سماج میں سب سے آخر میں بگاڑ مذہبی اور پڑھے لکھے طبقے میں آتا ہے اگر اس طبقہ میں بگاڑ آجائے تو پھر سماج کو برباد ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا، آج سماجی اور

پادری صاحب کو میں دعوت دیتا ہوں کہ باہر نکلئے تاکہ خودکشی پر آمادہ انسانیت کو بچایا جاسکے آج ہندو اور مسلمان کا مسئلہ نہیں مسئلہ انسانیت کا ہے مسئلہ خدا کی زمین پر زندہ رہنے کے استحقاق کا ہے، آج انسان انسانوں کے ساتھ ایسا سلوک کررہا ہے کہ بھیڑیے اور چیتے بھی نہیں کرتے، کیا آپ نے کبھی سنا کہ سانپوں نے کوئی فوج بنائی ہو، جنوب کے سانپوں نے شمال کے سانپوں پر حملہ کیا ہو۔ شمال کے شیروں نے جنوب کے شیروں پر بلہ بول دیا ہو، نہیں آپ نے نہیں سنا ہوگا کسی درندہ نے اغوا کی مہم چلائی ہو، نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا لیکن آج انسان یہ کررہا ہے سماج کرپٹ ہوتا چلا جارہا ہے آج اس کی فکر نہیں کی جارہی ہے یہ آواز ضرور سنائی دیتی ہے کہ فلاں قوم ملک چھوڑ کر چلی جائے، مسلمان جہاں سے آئے ہیں وہاں چلے جائیں، تو اگر یہی بات ہے تو میں کہتا ہوں کہ آئیے ایسا بھی کریں لیکن شرط یہ ہے کہ جو پہلے آیا ہے وہ پہلے جائے۔ آرین پہلے آئے ہیں وہ پہلے جائیں

جب ایک ایک فرد آرین کا چلا جائے گا تو پھر مسلمان بھی جانے کے لئے تیار ہوجائیں گے لیکن ذرا سنجیدگی سے سوچئے کیا یہ آسان ہے کیا یہ ممکن ہے میں تو کہتا ہوں کہ ایسا ہوگا تو قیامت ہی آجائے گی۔

حضرت مولانا کی مفصل تقریر کا رواں ترجمہ شستہ و شائستہ اور سلیس زبان میں ایڈیٹر صاحب نے کیا۔ ایک ایک نکتہ کو بڑی قوت اور روانی سے ادا کیا۔ حاضرین پر اس کا بڑا گہرا اور خوشگوار اثر ہوا۔

آخر میں پادری صاحب کی تقریر ہوئی تینوں رہنماؤں نے انسانیت کے فروغ کی کوششوں کو منظم انداز میں تیز کرنے پر زور دیا۔ بنگلور کی سرزمین پر کل ہند پیام انسانیت فورم کا یہ پہلا جلسہ بڑا کامیاب اور موثر ثابت ہوا، شکر ہے یہ جلسہ اختتام ہوا

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

لکھنؤ کے معروف عطریات
شمامۃ العنبر، زعفرانی حنا
مجموعہ وغیرہ
طلب فرمائیں
کارخانہ محمد سلیمان محمد یوسف
یوسف بلڈنگ ۔۔۔۔ [illegible]

پروپیگنڈہ اور نفسیاتی جنگ

از ـ ظاہر بن سعید داھبی .... ترجمہ/ خالد فیصل ....

بعض اہل رائے کے نزدیک پروپیگنڈہ مشکوک اغراض و مقاصد کے تحت افراد یا جماعتوں یا قوموں پر اثر انداز ہونے اور ان کے عادات و اطوار اور رجحانات و نظریات کو بدلنے کی سعی و کوشش کا نام ہے جس کا تعلق متعلق سوسائٹی، خاص وقت اور اہم غرض و غایت سے ہے۔ پروپیگنڈہ کی دوسری تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ عوامی یا قومی میڈیا (ذرائع ابلاغ) کو کسی خاص و متعین پارٹی کے کسی خاص مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے، ذہن و دماغ اور جذبات پر اثر انداز ہونے کی جد و جہد کا نام ہے خواہ وہ مقصد فوجی ہو یا اقتصادی یا سیاسی، خواہ اعتبار سے پروپیگنڈہ کی مختصر تعریف یہ ہے کہ وہ میڈیا (ذرائع ابلاغ) کے ذریعہ غیر جانبدار جماعت یا دشمن جماعت کے افراد کے قلوب، اذہان، اور وجدان و عاطفہ میں خاص حکمت عملی اور ٹیکنیک کے تحت اثر انداز ہونے کی کوشش کا نام ہے اس اعتبار سے پروپیگنڈہ نفسیاتی جنگ میں بنیادی و اساسی محرک و عامل ہے۔ چنانچہ ایک جرمن قائد نے اس کی حقیقت، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ:

"دشمن کے توپ خانہ کو برباد کرنے کے لئے ہم بم کا استعمال کرتے ہیں، کیا اس سے زیادہ موزوں و مناسب بات یہ نہیں ہے کہ جو ذہن توپ خانے کے استعمال کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، ان کو بدل دیا جائے، تاکہ وہ ہاتھ بھی جو توپ خانے کا استعمال کرتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں پروپیگنڈہ کا استعمال مختلف اغراض و مقاصد اور متنوع وسائل و ذرائع کے تحت کیا جاتا ہے، عرب اسرائیل جنگوں میں اسلام کے دعوتی طریقہ کار کو استعمال نہیں کیا گیا، ان کی جگہ غیر اسلامی وسائل نے لے لی، چنانچہ اس غیر اسلامی پروپیگنڈہ سے نہ مقصد حاصل ہوتا ہے نہ ہی ناواقف کی رہنمائی، اور نہ ہی فکر کی تشکیل ہوتی ہے دوسری طرف مختلف اغراض و مقاصد کے تحت دنیا میں پروپیگنڈہ کی منظم و مربوط تنظیمیں موجود ہیں۔ یہ تمام کے تمام طریقے، معاشرہ کے معیار و سطح کے اعتبار سے کامیاب ہیں اس سے ہم اتفاق کریں یا نہ کریں، وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں مثلاً امریکا، روس اور برطانیہ کے ریڈیو "ٹرانسمیٹر" کے

مسئلہ میں جنگ کے موقع پر، "پناما" کی حکومت گرانے کے موقع پر اور "گرینیڈا" پر حملہ کے موقع پر پروپیگنڈہ نے کامیاب اور اہم ترین رول ادا کیا ہے۔

اگر ہم اس (پروپیگنڈہ) کے سلسلہ میں ماضی کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ پروپیگنڈہ کا میدان بہت وسیع اور لامحدود ہے سنہ ۱۹۱۹ء میں "کومنترن" نامی پروپیگنڈہ کا ادارہ ماسکو میں قائم ہوا۔ اس ادارہ کی غرض و غایت دنیا میں رونما ہونے والی انقلابی تحریکات کی سرپرستی اور مبادی اشتراکیت کی نشر و اشاعت تھی اس لئے لینن و اسٹالن کا چرچہ پروپیگنڈہ اس قدر کیا گیا کہ اشتراکیت کا نظریہ وقت کی اہم پکار بن گئی، چنانچہ دکتور مصطفی خشادی نے کہا ہے کہ "اشتراکیت ایسا سامراج ہے جو ہوا میں سرایت کر گیا ہے اور وہ کینسر ہے کہ جب کسی قوم و ملت کے جسم کو لاحق ہوتا ہے تو اس کا اگر ایک جگہ علاج کیا جاتا ہے تو وہ دوسری طرف ابھر آتا ہے۔

پروپیگنڈہ :

پروپیگنڈہ کی مختلف قسمیں ہیں، چند اہم قسمیں ذکر کی جاتی ہیں۔ اس میں سرفہرست "سفید پروپیگنڈہ" ہے، یہ قسم بہت ہی عام اور واضح ہے، اس کا سرچشمہ حکومتی ذرائع ابلاغ بالخصوص اخبارات، جرائد، ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہیں۔ اس کا استعمال خاص و متعین مقصد میں ہوتا ہے لیکن زیادہ تر کھلی نفسیاتی جنگ میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

سیاہ پروپیگنڈہ :

پروپیگنڈہ کی دوسری قابل ذکر قسم "سیاہ پروپیگنڈہ" ہے یہ مخفی پروپیگنڈہ ہے اس کا دار و مدار خفیہ گفتگو پر ہے۔ اور اس کا صحیح و حقیقی سرچشمہ صیغۂ راز میں ہوتا ہے لیکن خفیہ طور پر پھیلتا ہے اور اثر انداز ہوتا ہے، یہ قسم زیادہ تر دشمن کی سرزمین یا اس کی سرحد سے قریب ہی جاری رہتی ہے اور سرد جنگ میں بہت ہی اہم رول ادا کرتی ہے، اس کام کو جاسوس انجام دیتے ہیں، اسی کو "ففتھ کالم" کہا جاتا ہے۔

بھورا پروپیگنڈہ

پروپیگنڈہ کی اہم قسم کا نام بھورا پروپیگنڈہ ہے۔ یہ قسم مختلف النوع مصادر و مراجع کی بنیاد پر عمل کرتی ہے۔ اس قسم پر عمل درآمد کرنے والے، اپنی سرگرمیوں کے سرچشمہ کے انکشاف کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتے۔

پروپیگنڈہ کی مذکورہ تین قسمیں ارباب فکر و نظر اور اصحاب تصنیف و تالیف کے نزدیک مرکز و محور کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن بعض لوگوں نے پروپیگنڈہ کی مزید قسمیں بیان کی ہیں، ان میں ایک مخفی پروپیگنڈہ ہے اس کی وجہ سے لوگوں کی عام رائے محفوظ و مامون نہیں ہوتی ہیں نیز یہ قسم مخفی گوشوں کو اہمیت دیتی ہے اس کے علاوہ اور بہت سی قسمیں ہیں جن کا احاطہ مشکل و ناممکن ہے لیکن اگر ان تمام اقسام پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام کے تمام اقسام مذکورہ تین ہی اقسام کی شاخیں ہیں بہرکیف بقیہ اقسام میں قابل ذکر "باغیانہ پروپیگنڈہ"، "منطقی پروپیگنڈہ" اور تحریضی پروپیگنڈہ ہیں۔

پروپیگنڈہ کے مقاصد:

پروپیگنڈہ، چاہے کسی طرح کا ہو، اس کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ ہم ذیل میں پروپیگنڈہ کے مذکورہ تین اقسام کے مقاصد بالترتیب بیان کر رہے ہیں چنانچہ "سیاہ پروپیگنڈہ" کی غرض و غایت حسب ذیل ہے

- دشمن کی صف میں انتشار اور ہیجان پیدا کرنا۔
- عصیان و نافرمانی پر ابھارنا، اور طاعت و فرمانبرداری کے خلاف جذبۂ بغاوت پیدا کرنا۔
- عوام الناس میں قیادت و سیادت کے خلاف شک و شبہ پیدا کرنا، اور قیادت کو توڑنا۔
- کسی مسئلہ کے بارے میں ذہن بدلنا۔

بھورا پروپیگنڈہ :

اس پروپیگنڈہ کا مقصد، سیاہ پروپیگنڈہ کے مقاصد سے ملتا جلتا ہے، البتہ یہ پروپیگنڈہ صراحۃً اور علانیۃً بھڑکانے کا کام کرتا ہے، اور واقعات گڑھ کر پیش کرتا ہے، صحیح جزئیہ کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس میں چند غلط عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔

پروپیگنڈہ :

اس کا مقصد معاشرہ و سوسائٹی کے محاسن کو اجاگر کرنا ہے نیز یہ قسم اکثر و بیشتر اجتماعی مسائل کو اہمیت دیتی ہے اور دشمن کے دلائل کے مقابلے دوسرے دلائل پیش کرتا ہے، اور سرکاری ذرائع ابلاغ کی تائید کرتا ہے اور سلبی پہلوؤں کو چھپاتا ہے۔

پروپیگنڈہ کا معیار و مستوی

پروپیگنڈہ کے دو معیار ٹیکنیکی اور اسٹراٹیجی ہیں ٹیکنیکی معیار مندرجہ ذیل ہیں

- پروپیگنڈہ کے لئے زیادہ سے زیادہ عمدہ اور موزوں لوگوں کے جذبات حاصل کرنا۔
- مجوزہ پروپیگنڈہ کے لئے حالات کو سازگار و موافق بنانا کہ سماج اسکو قبول کر سکے۔
- عامۃ الناس کی ضروریات، ترجیحات اور مطالبات کی تحقیق و جستجو کرنا ہے کہ پروپیگنڈہ میں اہم ترین ضروریات کو بالترتیب ملحوظ رکھا جائے۔
- مقصود لوگوں کے تہذیبی، ثقافتی، تمدنی اور اجتماعی معاملات اور امور کے متعلق معلومات جمع کرنا۔
- مقصد کے حصول کے لئے پلاننگ تیار کرنا۔
- عامۃ الناس کو تمام حقائق و واقعات سے بے خبر نہ رکھنا۔
- زمان و مکان کے حالات کی سازگاری کو ملحوظ رکھنا اور ان کی اہمیت کو کم نہ ہونے دینا۔ اسی طرح اسٹریٹیجک معیار پر پروپیگنڈہ حسب ذیل بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔
- معاشرہ کے مسائل میں کل رضامندگی پر اعتماد نہ کرنا۔
- معاشرہ کی جانب سے ادا کی گئی سرگرمیوں کو دوبارہ عملی جامہ پہنانے کی سعی کرنا اور ان پہلوؤں کو چھیڑنا جو بنیادی فکر کو متاثر کریں۔ یہ اسلام کے خلاف کئے جانے والے پروپیگنڈہ کی خاصیت ہے
- نئے مسائل کو ایجاد کرنا، تاکہ ان خارجی اشیاء کی روشنی میں اپنا کام انجام دے سکے۔ اور مقصود لوگوں میں اسٹراٹیجی پروپیگنڈہ کے وسائل اور طریقوں سے کبیدگی پیدا نہ ہو۔

پروپیگنڈہ کے اسالیب:

پروپیگنڈہ کے اسالیب بہت زیادہ ہیں، ان میں اہم اور ضروری اسلوب و طرز مندرجہ ذیل ہیں۔

- **لطیفہ کا اسلوب**: یہ اسلوب عام رائے میں بہت ہی موثر اسلوب ہے، اس اسلوب کا تعلق ان اقوام و ملل سے ہے جو عمدہ معاشی معیار کا خوگر ہو گئی ہیں۔
- **تکرار کا اسلوب**: اس اسلوب کا رابطہ اعلانیہ گوشوں سے ہے کہ پروپیگنڈہ باز پوری طرح مطمئن ہو جائیں کہ مجوزہ پروپیگنڈہ اذہان و قلوب میں راسخ و پیوست ہو گیا ہے۔
- **دینی اسلوب**: اسلامی معاشرہ میں اس نام کا اسلوب نامناسب ہے کیوں کہ اسلام میں اصلاً دین کا اسلوب اور دنیا کا اسلوب الگ الگ نہیں پایا جاتا، بلاشبہ اسلام مکمل دین کامل نظام و ضابطۂ حیات ہے لیکن دوسری سوسائٹیوں میں دین و مذہب کو کچھ مدت تک پروپیگنڈہ کی خدمت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے
- **کذب بیانی و افترا پردازی کا اسلوب**:

(باقی ص ۹ پر)

عورتوں کے خلاف جنگ

نسل انسانی کے لئے فال بد ہے

انگریزی پندرہ روزہ "نیشن" دہلی سے۔ ترجمہ/ جناب محی الدین صاحب

صنف کا ایک تحقیقی شفاخانہ بڑے بڑے اشتہار شائع کرتا رہتا ہے کہ "اب ہم آپ کو بتلا سکتے ہیں کہ آپ کا بچہ لڑکا ہوگا یا لڑکی"۔ لیکن جو بات اس اشتہار میں پنہاں ہے وہ اس سے زیادہ اہم ہے۔ اس کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اگر آپ کا حمل لڑکے کے بجائے لڑکی کا ہے تو آپ اس کو دنیا کی روشنی دیکھنے سے پہلے ہی قتل کر کے ان تمام تفکرات اور پریشانیوں سے چھٹکارہ حاصل کر سکتے ہیں جنہیں مستقبل میں آپ کو جھیلنا ہوگا، یہ تمام پریشانیاں یعنی بچی کا حمل تھوڑے سے خرچ اور طبی امداد کے ذریعہ ختم کی جا سکتی ہے۔

یہ صنف نازک کے خلاف جنگ کا ایک تازہ اور شدید ترین محاذ ہے، پچھلی ایک صدی میں ہندوستان میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کا تناسب برابر کم ہوتا گیا ہے۔ عورتوں کی تعداد میں یہ کمی نہ صرف تشویشناک ہے بلکہ اس کے سدھرنے کا کوئی امکان بھی نہیں ہے سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں ایک ہزار مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد ۹۷۲ تھی جبکہ سنہ ۱۹۹۱ء میں یہ تناسب کم ہو کر صرف ۹۲۹ عورتیں فی ایک ہزار مرد رہ گیا ہے۔

عورتوں کے ساتھ ظلم اور زیادتی نے انھیں اس حالت میں پہونچا دیا ہے، عورتوں پر مردوں کا بیجا تسلط بنیادی ذرائع آمدنی سے محرومی اور انسانی وقار اور حقوق سے محرومی، یہیں وہ چند وجوہ جو سنہ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے بعد عورتوں کی سات بڑی تنظیموں کی نظر میں ان کی حالت زار کی ذمہ دار تھیں۔

عورتوں کے خلاف ظلم کی یہ انتہا ہے کہ والدین لڑکی کی پیدائش کے خیال سے بھی خوفزدہ ہونے لگے ہیں۔ اور ان کی اس سعی نے کہ لڑکیاں نہ ہوں تو اچھا ہے، اسے ایک صنف میں تبدیل کر دیا ہے۔

بچیوں کا حمل ضائع کرنے والے کچھ مطب تو بے شرمی کی سطح پر اتر آئے ہیں۔ امرتسر کے ایک ڈاکٹر بھنڈاری کے اشتہار میں لکھا گیا ہے کہ "اس وقت پانچ ہزار روپئے خرچ کر کے مستقبل میں پچاس ہزار بچائیے" اس کا مطلب بچی کا حمل ضائع کرنے اور اس کی شادی میں خرچ ہونے والی رقم کے فرق کو واضح کرنا ہے

عورتوں کے تناسب میں کمی کی واحد وجہ بچیوں کا حمل ضائع کرنا نہیں ہے۔ مردوں اور عورتوں کے تناسب کی کمی کی وجہ سے اکیسویں صدی میں عورتوں کی جانب مردوں کا برتاؤ مکمل طور پر تبدیل ہو جانے کا امکان ہے۔

بچے کی پیدائش سے قبل مختلف قسم کی طبی جانچ کی جدید ترین شکل یہ معلوم کرنا ہے کہ رحم مادر میں پرورش پانے والے بچے کی صنف کیا ہے، بدقسمتی سے اسے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قصبات تک شہرت حاصل ہو گئی ہے۔ اس قسم کی طبی جانچ اب ایک تجارت کی شکل اختیار کر چکی ہے، لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ اس کے ذریعہ انھیں اس کا موقع حاصل ہو سکتا ہے کہ ان کے یہاں لڑکے کی پیدائش ہو یا لڑکی کی اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عورتیں اکثر معاشرہ کی مرضی کے خلاف، گھر کے دوسرے افراد کے زیر اثر، یا خانگی مجبوریوں کے تحت اس طبی جانچ کے لئے مجبور ہو جاتی ہیں، مثال کے طور پر سنہ ۱۹۸۰ء میں (رمنما اور بمباوالا) Ramanma & Bambawala کے ایک تحقیقاتی سروے سے یہ پتہ چلا تھا کہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ لڑکی کا حمل ہے ۹۵ فیصد عورتوں نے اپنا حمل ضائع کرا لیا تھا۔

بچے کی صنف کی طبی جانچ حمل کے بعد چودھویں اور سولھویں ہفتے کے درمیان ہی کی جا سکتی ہے۔ اور حمل پندرھویں اور اٹھارہویں ہفتے کے درمیان ضائع کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ حمل ضائع کرنے کا قانون The Medical Termination of Pregnancy Act 1971 حمل ہونے کے بارہویں ہفتے سے قبل حمل ضائع کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

آزادی نسواں کا یہ قانون ہر صورت ناکامیاب ثابت ہوا ہے، خواتین کی مختلف انجمنوں نے صحت، انسانی حقوق، اور صنف کی طبی جانچ کے خلاف انجمنیں سنہ ۱۹۷۶ء سے سنہ ۱۹۸۹ء تک لگاتار اس کے خلاف احتجاج کرتی رہی ہیں۔

محکمۂ خاندانی بہبود کے اعداد و شمار یہ بتلاتے ہیں کہ سنہ ۱۹۸۴ء کے بعد سے حکومت کے منظور شدہ اداروں میں تیس ۳۰ لاکھ حمل ضائع کئے گئے ہیں۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان میں سے ایک چوتھائی عورتوں نے طبی جانچ کے بعد لڑکی کی ولادت سے بچنے کے لئے حمل ضائع کرایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس عرصہ میں عورتوں کے تناسب میں ساڑھے سات لاکھ کی کمی ہوئی ہے (ٹائمس آف انڈیا ۱ جون سنہ ۱۹۹۱ء)

ڈاکٹر بھنڈاری کے مذکورہ اشتہار میں یہی تو کہا گیا ہے کہ کسی لڑکی کی شادی پر اخراجات سے جو ہر شخص کے بس میں نہیں ہوتے پیدا ہونے والی بچی سے ہاتھ دھو لینا زیادہ آسان ہے، جہیز کی یہ لعنت دو دھاری تلوار کی طرح ہے اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی لڑکی قتل کر دی جاتی ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ بچ جاتی ہے تو پھر شادی کے لئے اسے جہیز کے لالچی سسرال والے اسے جلا کر مار ڈالتے ہیں اور اس کا بزدل یا قاتل شوہر اپنے گھر والوں کے ساتھ اس جرم میں تعاون کرتا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود لوگ صرف اس پر بحث کرتے ہیں کہ کیا جہیز واقعی بری چیز ہے اس کے ساتھ یہ سوال بھی جڑا ہوا ہے کہ جہیز پر کس کا حق ہے۔ لڑکی کا یا اس کے سسرال کے رشتہ داروں کا؟

کچھ عرصہ سے عدالت عالیہ —— Supreme Court نے عورتوں کے حق میں فیصلے دے کر مثبت رویہ اختیار کیا ہے۔ ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۸۵ء کی عدالت کے اس فیصلہ نے کہ شادی کے وقت عورت کو دیئے جانے والے تمام تحائف اس کی نجی ملکیت ہوتے ہیں اور اس کی اجازت کے بغیر شوہر یا کسی رشتہ دار کو کسی قسم کا حق ملکیت حاصل نہیں ہوتا۔ ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لی ہے عورتوں کی تنظیموں نے اس فیصلہ کو خوش آمدید کہا ہے کیونکہ اس سے عورتوں کو اپنے شوہر کے خلاف ایک نیا ہتھیار مل گیا ہے۔

> ہندوستان کے صرف ایک صوبہ اتر پردیش میں سنہ ۱۹۹۰ء کے دوران ۲۱۰ عورتوں کی جان جہیز کی لالچ میں لی گئی دوسرے الفاظ میں ہر ۴۲ گھنٹے میں ایک عورت جہیز کی بدولت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے (پاینیر مورخہ ۱۳ اگست سنہ ۱۹۹۱ء)

جہیز ممانعت قانون سنہ ۱۹۶۱ء —— Dowry Prohibition Act 1961 کے دفعہ ۲ میں جہیز کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس کا مطلب ایسی کوئی جائداد یا قیمتی ضمانت جو بالواسطہ یا بلاواسطہ (الف) شادی کے ایک فریق کی جانب سے دوسرے فریق کو اور (ب) کسی فریق کے والدین یا کسی دوسرے شخص کی جانب سے شادی کے وقت یا اس سے پہلے یا اس کے بعد مہر کو مستثنا کرتے ہوئے دی جائے یا دیئے جانے کا وعدہ کیا جائے۔

۲۲ مارچ سنہ ۱۹۸۵ء کو عدالت عالیہ نے حکومت ہند کے نام یہ نوٹس جاری کیا کہ ہندو قانون وراثت سنہ ۱۹۵۶ء —— Hindu Succession Act 1956 کو خاندانی مشترکہ جائداد کے معاملہ میں شوہر اور اس کی بیوی کے رشتہ داروں کے درمیان امتیازی سلوک کرنے کی بنا پر دستور ہند کے خلاف کیوں نہ قرار دے دیا جائے۔ دستور کے آرٹیکل (۳) ۱۵ میں یہ کہا گیا ہے کہ عورتوں اور بچوں کے لئے مخصوص انتظام کی خاطر قانون بنانے کے لئے ریاست کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوگی۔

قانونی موشگافیوں سے قطع نظر عورتوں کے حقوق کے لئے لڑنے والی بہت سی خواتین کا خیال ہے کہ یہ ساری باتیں عورتوں کو ان کی وراثت سے محروم رکھنے کے بہانے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ لڑکیوں کو جہیز کی شکل میں کچھ دے کر ان کے والدین کی وراثت سے محروم رکھا جائے، حتی کہ جو روپیہ پیسہ اور قیمتی اشیاء جہیز کے نام پر دی جاتی ہیں انھیں بھی شوہر اور اس کے رشتہ دار ہضم کر جاتے ہیں، اور عورت دوسروں کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہے

خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنے والیاں یکسر جہیز کے خلاف نہیں ہیں کیونکہ اگر کسی لڑکی کو جہیز بھی نہیں ملتا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ اسے والدین کی جائداد سے بھی کچھ نہ ملے۔

سرکاری تخمینوں کے مطابق ہر سال تین ہزار سے زائد عورتیں جہیز کی خاطر جلا دی جاتی ہیں۔ اور اس سے کہیں زیادہ تعداد میں عورتوں کو بے گھر و بار کر کے مفلوک الحال زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے مدھو کشور کا کہنا ہے کہ، ان تمام قواعد و قوانین کے باوجود جہیز کے چلن میں کوئی کمی نہیں آئی ہے سیاستداں، جج، اعلیٰ سرکاری ملازمین اور باعزت شہری بھی جہیز لیتے ہیں۔

جہیز کی خاطر عورتوں کی جان لینے کے خلاف ہونے والے ظلم و جبر کی صرف ایک

اسلام اور علمائے سوء

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی
ڈین فیکلٹی زبان ادب و صدر شعبہ عربی کالی کٹ یونیورسٹی
کالی کٹ کیرالا

اسلام کا پورا مذہبی نظام علماء پر انحصار کرتا ہے۔ اگرچہ عبادت اور ریاضت میں آزادی ہے ایک فاسق انسان بھی نماز پڑھا سکتا ہے مگر مذہبی طور پر علماء کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ ان کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ ان کے علم کو باعث رشک قرار دیا گیا ہے اور قرآن مجید نے تو یہاں تک کہدیا کہ:

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء

اللہ کے بندوں میں سے اس سے ڈرنے والے صرف علماء ہیں۔

ان تمام حقائق کے بعد بھی علماء کی دو قسم کی گئی ہے۔ علماء حق اور علمائے سوء۔ تعریف علماء حق کی کی گئی ہے حتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل علم کی فضیلت غیر اہل علم پر ایسی ہی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے کم تر آدمی پر "کفضلی علی ادناکم" علمائے سوء وہ گروہ ہے جو علم کو اپنے ذاتی و شخصی نفع کے لئے استعمال کرتا ہے جو علم کو اپنے کو لوٹتا ہے، ان کے مذہبی جذبات کا استحصال کرتا ہے ان کا کام تب ہے کہ اگر حکومت و سلطنت ہو تو حکومت کا ساتھ دینا اور غلط فتوے صادر کرنا۔ دوسری طرف وہ بدعات و رسومات جو عوام میں رائج ہیں ان سے نفع اٹھانا اور ان کو جائز قرار دینا ان کا پیشہ ہے۔ بڑے غضب کی اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ یہ عوام کا دین بھی شرک کو جائز کر کے خراب کرتے ہیں اور ان سے پیسے بھی لوٹ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت مجدد الف ثانی احمد سرہندی جہانگیر کے دربار میں پہونچے تو ان سے بادشاہ کو سجدہ کرنے کو کہا گیا، مگر انھوں نے انکار کیا اور فرمایا کہ سجدہ سوا خدا کے اور کسی کو جائز نہیں ہے علمائے سوء وہاں موجود تھے انھوں نے کہا کہ جب جان کا خطرہ ہو تو جائز ہے اگر سجدہ نہ کیا تو آپ قتل کر دئے جائیں گے؟ اس پر امام احمد سرہندی نے فرمایا کہ بے شک اضطرار کی حالت میں سجدہ کرنے بلکہ سور کا گوشت کھانے تک جائز ہو جاتا ہے۔ مگر وہ رخصت ہے عزیمت یہ ہے کہ سجدہ نہ کیا جائے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ اس پر علمائے سوء کے بہکانے سے بادشاہ نے ان کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ مگر انھوں نے سجدہ نہیں کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اکبر کو گمراہ کرنے اور علماء پر سے بلکہ دین سے اس کے اعتقاد کو خراب کرنے میں علمائے سوء کی طمع پرستی شامل تھی جنھوں نے اپنی زر پرستی سے اسلام کو نقصان پہونچایا۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اس دور کے جو سرکاری طور پر شیخ الاسلام تھے۔ انھوں نے اپنے گھر میں اپنے باپ دادا کی دو قبریں بنا رکھی تھیں اور ان میں سونا اور چاندی بھر کر رکھا تھا۔ اسی طرح یہ حضرت زکوۃ ادا نہیں کرتے تھے بلکہ گیارہ مہینے سونا، چاندی اور پیسے اپنے نام رکھتے تھے اور بارہویں مہینہ اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیتے تھے یعنی اس پر سال نہیں گذرتا تھا جس کو "حولان حول" کہتے ہیں گیارہ مہینہ پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی جب تک مال پر پورا سال گذر جائے۔ تب ہی زکوۃ واجب ہوتی ہے۔ مگر یہ حضرت الٹ پھیر کر کے سال گذرنے بھی نہ دیتے تھے، سوال یہ ہے کہ کیا یہ ترکیبیں اللہ کی نظر سے پوشیدہ ہیں۔ بہرحال جب شیخ الاسلام صاحب پکڑے گئے تو ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے اسلام کی بدنامی بھی ہوئی اور بادشاہ ان سے بدظن بھی۔ بلکہ اکبری دور میں ابوالفضل اور فیضی بھی ایران کی نقطوی تحریک کے داعی تھے اور انھوں نے اکبر کو گمراہ کیا نیا دین بنانے میں اس کے دست راست رہے یعنی "دین الٰہی" کو۔ علمائے سوء کے خلاف محمد بن عبدالوہاب نجدی کو جہاد کرنا پڑا اس لئے کہ عوام میں گمراہی پھیلانے اور بدعات کو عین دین بنانے کے ذمہ دار یہی لوگ تھے ہندوستان میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک کا ایک جز، اور ایک اہم پیغام دعوت توحید تھا۔ یہ تحریک بھی علمائے سوء کے خلاف تھی۔ ان دنیادار علماء نے فتوے جاری کر دیے تھے کہ سید احمد بے دین اور کافر ہیں، چنانچہ جب پنجتار میں جس کو سید صاحب نے اپنا مستقر بنایا تھا اور ۴ برس وہ جہاد کا کام کرتے رہے، وہاں سازش کر کے ان لوگوں نے ایک رات سارے مجاہدوں کو قتل کر دیا، مگر سید صاحب زندہ بچ گئے۔ اب یہ مفسدین بہت ڈرے کہ سید صاحب ان سے قتل کا انتقام لیں گے۔ سید صاحب نے سب کو جمع کر کے تقریر فرمائی کہ میرا اور میرے ساتھیوں کا وطن چھوڑ کر ہجرت کرنا اور یہاں جہاد کرنا فی سبیل اللہ ہے خدا کے لئے پھر تم نے مجاہدین کو اس ہجرت و غربت میں کیوں قتل کیا۔ اس پر وہ بولے کہ آپ ہماری لڑکیوں کی زبردستی شادی کر دیتے ہیں اور آپ کے خلاف ہمارے پاس فتوے موجود ہیں کہ آپ بے دین اور خارج از اسلام ہیں۔ انھوں نے علمائے سوء کے فتوے پیش کئے حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ تم لڑکیوں کو بڑی عمر بٹھلاتے ہو پیسے وصول کرنے کے لئے یہ جائز نہیں۔ ہم نے تمہاری مرضی سے شادیاں کرائی ہیں ان سب کو معاف فرما دیا اور پنجتار کو چھوڑ دیا، اور فرمایا کہ مجھ کو اس جگہ سے اتنی نفرت ہے جتنی آدمی کو اپنی قے سے ہوتی ہے۔ اس صدی کے اوائل میں ہندوستان میں علمائے سوء نے بریلویت کے نام سے جتھہ بندی کی اور علماء کا ایک پورا فرقہ وجود میں آگیا جو قبر پرستی کو جائز قرار دیتا ہے تعزیہ داری، اولیاء کے نام پر ذبیحہ، شب برات تیجہ، چالیسواں، قبر پر چادریں۔ عرس میلاد غرض تمام بدعات کے بارے میں یہ باقاعدہ فتوے جاری کرتے ہیں جواز کے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس میں اس کا نقشہ بڑا عمدہ کھینچا ہے۔

اسلامی تاریخ میں علمائے سوء نے بڑی گندی ذہنیت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے بادشاہوں وزیروں و امیروں کو اکسایا ہے اور قید و بند میں مبتلا کرایا ہے۔ بلکہ دار و رسن تک پہونچایا ہے۔ امام ابن تیمیہ کے خلاف انھوں نے پروپیگنڈہ کر کے ان کو جیل بھجوایا۔ جہاں وہ لکھتے پڑھتے رہے آخر میں ان سے کاغذ قلم دوات بھی چھین لی گئی۔ مگر بعض رسائل انھوں نے کوئلہ سے دیوار پر لکھے ہیں۔

آخر میں اپنا وقت وہ قرآن مجید کی تلاوت میں صرف کرتے تھے ساٹھ بار قرآن مجید ختم کر ڈالے تھے۔

ان علماء سوء کی باہم چشمک اور کشمکش نے اسلام کو بڑا نقصان پہونچایا ہے ان کے ایمان کا یہ حال ہے کہ جب حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی شکست اور شہادت کی خبر دہلی پہونچی تو اردو کے شاعر شاہ نصیر نے جو زبردست بدعتی تھے۔ مجاہدین و شہدائے بالاکوٹ کی ہجو لکھی، مگر اسی دور کے ایک شاعر مومن خاں مومن نے مثنوی جہاد لکھ کر اپنا نام روشن کر دیا۔ علمائے سوء اور علمائے حق کی کشمکش آج ہندوستان کے ہر شہر اور ہر قریہ میں جاری رہی۔ اور امت کو بڑا نقصان پہونچانے والے علماء سوء ہیں جو جعفر و صادق کا رول ادا کرتے ہیں: ؎

جعفر از بنگال صادق از دکن
ننگ آدم، ننگ دین، ننگ وطن

مفتی عبدالعزیز رائے پوری کا حادثۂ انتقال

۲۰ دسمبر جناب مفتی عبدالعزیز صاحب رائے پوری طویل علالت کے بعد رحلت فرما گئے، یہ خبر سن کر علمی و دینی حلقے میں غم کی لہر دوڑ گئی۔

مولانا مرحوم حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کے جاں نثاروں میں تھے مکاتب مساجد کا قیام اور ان کی آباد کاری مرحوم کی زندگی کا اصل مشن تھا۔ خصوصاً ہریانہ ہماچل پردیش میں ان کی سعی سے متعدد مدارس و مساجد کا قیام عمل میں آیا۔ مختلف مدارس کے مہتمم تھے حضرت مولانا علی میاں ندوی سے خصوصی تعلق و مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے مفتی و استاذ حدیث رہے کچھ عرصہ تک مدرسہ مظاہر علوم رجسٹرڈ کے عہدہ نظامت پر بھی فائز رہے۔ مفتی عبدالعزیز صاحب رحلت کی خبر پر مختلف لوگوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے ان کے انتقال کو عظیم سانحہ سے تعبیر کیا ہے

ضرورت مدرس و مدرسہ برائے جامعۃ النور
پٹن۔ گجرات
ایک ایسے صالح ذی استعداد عالم کی ضرورت ہے جن کی اہلیہ یا والدہ بھی عالمہ ہوں تاکہ بچوں کے ساتھ بچیوں کو بھی عربی اردو وغیرہ کی تعلیم دی جاسکے۔
تفصیلی معلومات کے لئے حسب ذیل پتہ پر مراسلت کریں۔
جناب محمد اقبال زرگر
محلہ ختار واڑہ۔ پٹن (PATAN) گجرات — PIN. 384265

...عورتیں رواج ہے اور سر عام رواج ہے کہ لڑکوں کو مناسب اور صحت بخش غذا دی جاتی ہے اور لڑکیوں کو ضرورت سے کم اور ناقص غذا تاکہ وہ بیمار ہو کر مر جائیں یہ رواج اس قدر عام ہے کہ اسے برا بھی نہیں سمجھا جاتا۔ ان تمام باتوں کے ساتھ پیدائش کے وقت اموات کی شرح زیادہ ہونے کی وجہ سے مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔ حالانکہ عورتوں کی اوسط عمر مردوں کے مقابلہ میں پانچ سے ۶ سال زائد ہے۔ ان معاشروں میں جہاں عورتوں کی غذا میں امتیاز نہیں ہوتا اس کی اوسط اور زیادہ ہوتی ہے۔

زنا بالجبر، تشدد اور مجرمانہ غفلت نے عورتوں کو بے بسی کی انتہا پر پہنچا دیا ہے۔ رحم مادر میں بچیوں کا قتل۔ انھیں آہستہ آہستہ اثر کرنے والے زہر دینا، جہیز کے لئے مار ڈالنا، ستی، زنا بالجبر اور ایسے ہی دوسرے جرائم کا ارتکاب مسلسل ہو رہا ہے۔ زیادہ تر ان جرائم میں پولیس خود شامل ہوتی ہے یا اس کے ایما سے ان کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خواتین کی بہبود کے لئے کام کرنے والوں کو حکومت پر کوئی بھروسہ نہیں باقی رہ گیا ہے۔

ایسے معاملات میں اخبارات بھی ہمیشہ مدد نہیں کرتے، اکثر وہ خبروں کو سنسنی خیز بنا کر یا انھیں بالکل غلط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جن ستا جیسے مقبول عام قومی اخبار نے روپ کنور کے ستی کے واقعہ کی حمایت کر کے کوئی نیک نامی نہیں کمائی تھی۔

ستی کی حمایت کرنے کے باوجود کچھ سیاستدانوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی وجے راجے سندھیا جو خود بھی بیوہ ہیں، ستی کی حمایت کرتی ہیں حالانکہ نہ تو وہ خود ستی ہوئی تھیں اور نہ ان کے خاندان میں کسی نے ایسا کیا تھا۔ شاید ستی ہونا انھیں چھوڑ کر دوسروں کے لئے ایک نیک عمل ہے۔

ستی کی حمایت کرنے کے باوجود مرکز میں وزیر کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے اور کے آر ملکانی جیسے لوگوں کا ایک قومی سیاسی پارٹی میں باعزت مقام حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا سماج عورتوں کے خلاف جرائم کو معمولی بات سمجھتا ہے۔ زنا بالجبر بھی تشدد کی ایک شکل ہے اور اکثر وہ جنسی پولیس والے اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مدھیہ پردیش میں قبائلی عورتوں کے خلاف پولیس کے اس جرم کی اتنی کثرت ہے کہ وہاں کے وزیر اعلیٰ کو انھیں یہ صلاح دینی پڑی کہ اسمبلی کے زمانہ میں ایسے واقعات نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس سے اسمبلی میں ہنگامہ جیسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

چونکہ زنا بالجبر کے بہت سے واقعات میں مجرم پکڑے ہی نہیں جاتے اور ان میں سے بھی بہت کم کو سزا ہوتی ہے لہٰذا اس کے متعلق اعداد و شمار جمع نہیں کئے جا سکتے بلکہ زنا بالجبر کے بہت سے واقعات کی رپورٹ پولیس میں لکھائی ہی نہیں جاتی۔ پولیس کے تحقیقاتی ادارہ کے مطابق زنا بالجبر کے واقعات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں اس جرم کی تعداد ملک میں ۳۰۸۰ تھی جو ۱۹۸۶ء میں بڑھ کر ۱۲۰۳۶ تک پہونچ گئی تھی۔ یہ وہ تعداد ہے جس کی رپورٹ پولیس میں درج کرائی گئی تھی۔ غیر درج شدہ جرائم کی تعداد تو اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔

عورتوں کی سماجی بہبود کی ایک مشہور کارکن پرمیلا ڈنڈوتے کا کہنا ہے کہ اس جرم کی ایک رپورٹ کے مقابلہ میں تقریباً بیس کا اندراج نہیں کرایا جاتا۔

زنا بالجبر کے واقعات مدھیہ پردیش اتر پردیش اور مہاراشٹر میں خاص طور پر زائد ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں ان ریاستوں میں انکی تعداد علی الترتیب ۱۸۲۵ — ۱۳۳۷ — اور ۸۳۰ تھی۔ زنا بالجبر کا شکار ہونے والی عورتوں میں سب سے زیادہ یعنی ۶۵ فیصد کی عمر ۱۶ اور ۳۰ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ ۱۶ سال تک کی لڑکیوں کا اوسط ۱۸ فیصد اور ۳۰ سال سے زائد عمر کی عورتوں کا اوسط ۱۷ فیصد تھا۔

زنا بالجبر کے واقعات کی تعداد میں زیادتی کے ساتھ ساتھ چونکہ اس جرم کے مرتکب اکثر و بیشتر پولیس کے افراد یا با اثر لوگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا مظلوم عورتوں کو انصاف ملنے کی کم ہی امید ہوتی ہے۔ ایک سروے سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اسی فیصد طوائفوں نے زنا بالجبر کا شکار ہونے کے بعد یہ پیشہ اختیار کر لیا تھا کیونکہ اکثر اوقات ایسی عورتوں کے خاندان کے لوگ ان عورتوں کو واپس لینے سے انکار کر دیتے ہیں اور ان کے پاس جسم بیچنے کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اکثر ایسی عورتیں خودکشی بھی کر لیتی ہیں اور ان کی شادی بھی نہیں ہو سکتی۔ پولیس والے ایسے قسم کے نازیبا سوال کرتے ہیں، اور کبھی کبھی ان سے سارے کپڑے اتار کر یہ بتلانے کے لئے کہتے ہیں کہ واقعہ کس طرح ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر عورتیں اس طرح کا شکار ہونے کے بعد اس کی رپورٹ کرانا نہیں چاہتیں۔

تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۵ میں زنا ایسا جنسی فعل ہے جو کسی عورت کی مرضی کے خلاف اسے جان سے مارنے یا مارنے پیٹنے کی دھمکی دے کر کیا جائے یا اگر مرضی حاصل کر کے کیا جائے تو مرد یہ جانتا ہے کہ اس وہ عورت کا شوہر نہیں ہے لیکن عورت کو یہ یقین دلایا گیا ہو کہ زانی اس کا شوہر ہے یا سولہ سال سے کم کسی لڑکی کے ساتھ اس کی مرضی سے یا اس کی مرضی کے بغیر کیا جائے۔

اس سے قطع نظر کہ زنا بالجبر کے بہت سارے واقعات کا اندراج ہی نہیں ہوتا۔ متھرا میں ۱۹۷۹ء کے واقعات، حمیدہ بی ۱۹۷۹ء مایا تیاگی ۱۹۸۰ء اور بسنتی دیوی ۱۹۸۱ء کے زنا کے واقعات اس لحاظ سے شہرت رکھتے ہیں کہ پولیس نے ان تمام جرائم میں متعلقہ عورتوں کو بدچلن ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح بلجھی بہار میں ۳۱ فروری ۱۹۷۹ء کو عورتوں کے ساتھ اجتماعی زنا بالجبر اور اپریل ۱۹۷۸ء میں حیدرآباد میں رمیزہ بی کے ساتھ زنا بالجبر میں خود پولیس والے ملوث تھے۔ ان جرائم میں شرکت کرنے والے پولیس والوں کے خلاف کوئی سخت قدم کبھی نہیں اٹھایا جاتا۔

مختلف قوانین اور وقتاً فوقتاً آئینی تبدیلیوں کے باوجود زنا کے جرم میں کمی نہیں آئی ہے بلکہ یہ بڑھ رہے ہیں۔ قانون جرائم (ترمیمی) بل ۱۹۸۰ء The Criminal Law Bill 1986 نے ۱۹۸۳ء میں قانون کا درجہ حاصل کر لیا اس کے ذریعہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۵ میں ترمیم کی گئی تھی جس کے تحت زنا بالجبر سات قسم میں بانٹا گیا تھا۔ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۲۷ میں ترمیم کر کے اس کا انتظام کیا گیا ہے کہ زنا بالجبر کا مقدمہ تنہائی میں سنا جا سکتا ہے۔ قانون شہادت ۱۸۷۲ء میں ایک نئی دفعہ ۱۱۴۔ الف کا اضافہ کیا گیا ہے جس کی رو سے زنا کے کچھ معاملات میں یہ مظلوم عورت کی عدم رضامندی کو فرض کر لیا جاتا ہے۔ دفعہ ۳۷۶ (الف) (ب اور د) کے ذریعہ ایک نئے جرم کا اضافہ کیا گیا ہے جس کے تحت کسی ایسے سرکاری ملازم جس کی حراست میں کوئی عورت ہو جیل کے سپرنٹنڈنٹ، ریمانڈ ہوم کے انچارج اسپتال کے کسی ڈاکٹر کی مریضہ کے ساتھ جنسی فعل کو غیر قانونی جنسی فعل کا نام دیا گیا ہے۔

لیکن ان تمام قوانین کے باوجود مجرم کی ذہنیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے مہیلا دکشتا، ہندوستانی خواتین کی قومی فیڈریشن۔ جوادی مہیلا سماج۔ استری سنگھرش۔ چنگاری۔ مہیلا سیتکاری سنگھٹن، سہیلی اور مانوشی جیسی خواتین کی مختلف انجمنوں نے عورتوں پر مظالم کے خلاف برابر آواز اٹھائی ہے لیکن مدھو کشور کا کہنا ہے کہ "عورتوں کے خلاف ظلم بڑھتا جا رہا ہے"

کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ خواتین کی تنظیمیں اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہی ہیں۔

عورتوں کے خلاف مختلف انداز سے ان بڑھتے ہوئے جرائم نے بہت سی باہمت خواتین کو مایوسی میں مبتلا کر دیا ہے ان کی ناراضگی، تکلیف اور مایوسی کا اندازہ صف اول کی سماجی کارکنوں سے بات کرنے پر ہوتا ہے۔ سماج کی بے حسی اور بے عملی انکے لئے روح فرسا ہے۔

عورتوں کے مسائل اس سطح پر پہونچ گئے ہیں کہ اب ان پر ہمارے سماجی قائدین کو فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ عورتوں کے بنیادی حقوق کی کما حقہ رعایت کئے بغیر حالات میں کسی قسم کے سدھار کی امید نہیں کی جا سکتی۔ عورتوں کے لئے یہ خطرات ایک طرح سے مردوں کے لئے بھی خطرہ ہیں اور نسل انسانی کے لئے فال بد بھی۔

(پندرہ روزہ پنشن اینڈ دی ورلڈ)
"مجلہ یکم اگست ۱۹۹۱ء"

بمبئی میں
آپ کی زندگی میں مسرتوں کی مٹھاس گھولنے کیلئے
طہورا سویٹس
پیش کرتے ہیں ہمہ اقسام کی خوش ذائقہ، دل پذیر، لاجواب اور صحت بخش مٹھائیاں
اسپیشل سوہن حلوہ | مینگو برفی | انجیر برفی | پان اسپیشل برفی | قلاقند
سوتر فینی | ملائی کھاجا | پھول کھاجا | سادہ کھاجا | مادہ سوت
ہماری مٹھائیاں دیسی گھی، زعفران اور میووں کے زیورات سے آراستہ کر کے بہترین صفائی سے تیار کی جاتی ہیں
فون ۳۰۹۱۳۱۸ — ۳۰۸۲۷۷۲
۲۲۵/۲۵ بلاسس روڈ دوکان نمبر ۱ ناگپاڑہ جنکشن بمبئی ۸

جنوبی ہند میں:

کل ہند پیام انسانیت فورم کے دو اہم جلسے

ابوحامد غازی پوری

بنی نوع انسان کے لئے سب سے بڑا امتیاز اور سرمایہ افتخار اس کی وہ انسانیت ہے، جو عقل، شعور، ادراک اور وجدان سے عبارت ہے۔ اسی بنیاد پر اس کو خلافت ارضی کا مستحق گردانا گیا۔ اور تکریم آدم کا مرصع تاج اس کے سر پر رکھا گیا، قدرت کے فیاض ہاتھوں نے عقل و شعور و ادراک کی ایسی زبردست قوت سے اس کو نوازا کہ جس کے ذریعہ مخلوقات ارضی کو مسخر کرنے، اور عارض گیتی کو سنوارنے اور بنانے کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ مخلوقات سماوی خلافت و نیابت کے عطا کردہ فریضہ کو انجام دینے پر رشک بھری نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اور تسامحات و چوک پر اپنے رب سے اس کے حق میں مغفرت و درگذر کی طالب ہوتی ہے۔

لیکن یہی انسان جب اپنے اس وصف امتیازی کو فراموش کر دیتا ہے تو انسان نما بھیڑیا، درندہ، موذی جانور، اور حشرات الارض سے زیادہ بے وقعت اور خطرناک ہو جاتا ہے۔ اسے موقع ملتا ہے تو معصوم انسانوں کا خون بہاتا ہے۔ انسانی سماج میں اس کا وجود ایک ایسا رستا ہوا ناسور بن جاتا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اور "ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ" کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

آج ہمارا معاشرہ کچھ ایسا ہی ہو گیا ہے۔ انسان انسان کا شکاری ہو گیا ہے، دفتروں، کاروباری مرکزوں، تعلیمی اداروں، فلاح و بہبود کے نام پر قائم کی ہوئی انجمنوں سے لے کر سیاسی میدانوں کے ہر ہر قدم اور ہر ہر مقام پر اس کے عبرت انگیز، الم انگیز، بلکہ شرم انگیز مناظر کا مشاہدہ ہمہ وقت ہوتا رہتا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس کے خلاف اجتماعی آواز اٹھائی جائے۔ بنی نوع انسان کو اس کا مقام یاد دلایا جائے رحمت و حکمت کا بھولا ہوا سبق پڑھایا جائے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ باہم مل جل کر رہنے کا طریقہ بتایا جائے۔ بقائے باہم کے اصول سکھلائے جائیں۔ لیکن خود غرضی اور خود فراموشی کی دنیا میں یہ آواز نامانوس ہوتی چلی گئی اس کی سب سے بڑی ذمہ داری اس امت پر عائد ہوتی ہے جس کے خمیر ہی میں دعوت رکھی گئی ہے اور حکمت سے اس کو جوڑ دیا گیا ہے، یہی وہ حالات اور ذمہ داری کا حقیقی شعور و احساس تھا جس نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کو بے چین کر دیا اور انسانوں کو انسانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لئے عملی جد و جہد کا فورم "حلقۂ پیام انسانیت" کے نام سے تشکیل دیا گیا، ہندوستان کے طول و عرض میں اس فورم کے کئی مؤثر جلسے ہوئے۔ اور برادران وطن کو یہ احساس ہوا کہ اس میدان میں پیر دانا، کی یہ جد و جہد کس قدر ملک و وطن کے لئے مفید اور مثبت ہے، کیونکہ انھیں یاد دلایا گیا کہ جس مالک نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے وہ ظلم و ناانصافی کو پسند نہیں کرتا۔ حق تلفی کرنے والی قوموں کی بساط چشم زدن میں الٹ دی گئی ہے قوموں کی بقا کا سراغ دیگر خرابیوں کے ساتھ بھی تاریخ کی شہادتوں اور واقعات سے ملتا ہے۔ لیکن ظلم کے ساتھ قوموں کی زندگی کا آخری ورق بھی الٹ دیا گیا ہے۔

ابھی حال ہی میں پیام انسانیت فورم کا اہم اجلاس بھٹکل اور منگلور میں ہوا۔ جنوبی ہند فرقہ وارانہ تعصب سے بہت حد تک پاک تھا۔ ہندو مسلمان باہم شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ شمال کے گنگا و جمنا کے دو دھاروں کا حقیقی سنگم جنوب کے شہروں اور قصبات و دیہات میں نظر آتا تھا، لیکن چند سالوں سے اس عفریت کے خون آشام پنجے جنوب میں بھی پہونچ گئے، اور میسور، بنگلور، ہاسن، حیدرآباد، شیموگہ، بھدراوتی، ہبلی اور بھٹکل جیسے مامون شہروں میں ظلم و بربریت کا ایسا ننگا ناچ ہوا کہ انسانیت کا سر شرم سے جھک گیا۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ ان مقامات پر سنجیدہ، باوقار اور خصوصاً مذہبی لوگوں کو اس موضوع پر دعوت دی جائے، چنانچہ بھٹکل میں ۲۹ نومبر ۱۹۹۱ء کو بڑے پیمانہ پر حلقۂ پیام انسانیت نے ایک اجتماع کا پروگرام مرتب کیا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے اس دعوت کو قبول فرمایا اور ساتھ ہی ساتھ اس علاقہ کے ہی نہیں بلکہ ہندوؤں کے اہم دھرم ادھیکاری... دھرم استھل اڑپی کے ذمہ دار کو بھی دعوت دی گئی، اور اڑپی کے بڑے مندر کے پجاری ہیگڑے مہاراج کو بھی مدعو کیا گیا۔ دونوں صاحبان نے حضرت مولانا مدظلہ کی اس فروغ انسانیت کے پیام کی منظم کوشش کو محض سراہا نہیں بلکہ عملاً شرکت بھی کی۔

۲۹ نومبر کا دن بھٹکل کی تاریخ میں ایک یادگار و تاریخی دن تھا، ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ کنڑا اور اردو میں بینر لگائے اور جگہ جگہ استقبالیہ گیٹ بنائے گئے، گذشتہ سال بھٹکل میں فساد کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب عوام ہی نہیں بلکہ خواص کی سطح پر ہندو اور مسلمان ایک ساتھ ایک اہم مقصد کے فروغ کے لئے بیٹھ رہے تھے۔ دھرم استھل کے دھرم ادھیکاری جو اپنے آشرم سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ ان کی آمد کی وجہ سے برادران وطن کی شرکت اتنی زیادہ تھی کہ شاید کسی موقع پر ایسا منظر سامنے آیا ہو۔

شام کو چار بجے جلسہ کی کاروائی انجمن گراؤنڈ میں شروع ہوئی۔ اس موقع پر حضرت مولانا نے بڑی مؤثر، وقیع اور "از دل خیزد بر دل ریزد" کی مصداق تقریر فرمائی کم از کم پچاس ہزار کا مجمع آواز بر گوش تھا۔ تقریر کا ترجمہ جب کنڑا زبان میں ہوا تو برادران وطن پر ایسا تاثر تھا جس کا مشاہدہ خال خال ہی ہوا کرتا ہے۔ دھرم ادھیکاری نے اس تقریر کی سو فیصد تائید کی اور کہا کہ "ہمارے یہ بزرگ میدان میں نکل آئے ہیں۔ ہمیں اس میں بھرپور تعاون کرنا ہے۔ میں اس سلسلے میں وشو ہندو پریشد کے جلسوں میں اس موضوع کو اٹھاؤں گا۔ موصوف کی اہمیت یوں بھی تھی کہ وہ خود بھی وشو ہندو پریشد کے بانیوں میں سمجھے جاتے ہیں۔ مغرب سے پہلے پہلے یہ جلسہ اختتام کو پہونچا۔ جناب عبدالکریم پاریکھ صاحب نے ٹھیٹھ ہندی اور مراٹھی میں مختصر مگر جامع تقریر فرمائی۔ مجمع پر اس کا بڑا خوشگوار اثر ہوا۔ بھٹکل میں دس بارہ سال کے بعد پیام انسانیت کا دوسرا پروگرام تھا۔ جو بڑا کامیاب اور مؤثر ہوا۔

یکم دسمبر کو پیام انسانیت کا دوسرا اور اہم پروگرام منگلور جیسے صنعتی اور تجارتی شہر میں ہونے والا تھا۔ پیام انسانیت کے سکریٹری جناب پروفیسر انیس صاحب چشتی شب و روز کی محنت اور منگلور کے اہم احباب کے تعاون سے ہندوؤں اور عیسائیوں کے پیشواؤں کو اس میں شرکت کے لئے دعوت ہی نہیں بلکہ راضی کر چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چشتی صاحب کو بڑی سوجھ بوجھ اور متوازن فکر سے نوازا ہے۔ اور سب سے بڑی بات کہ حضرت مدظلہ کا اعتماد انھیں حاصل ہے، بھٹکل کے پروگرام کی کامیابی کا سہرا حقیقت میں انھیں کے سر جاتا ہے۔ یہاں بھی انھوں نے انتھک کوشش کی بالآخر یونٹی ہیلتھ کامپلکس کے ذمہ دار ڈاکٹر حبیب الرحمن صاحب اور دیگر رفقاء کے تعاون سے قلب شہر کے ایک وسیع ہال میں بعد نماز مغرب جلسہ کا آغاز ہوا۔ ڈائس پر حضرت مولانا مدظلہ کے علاوہ ہرے راما ہرے کرشنا، مشن کے سوامی کے علاوہ کیتھولک چرچ کے جرمن نژاد پادری صاحب بھی تھے پورا ہال تعلیم یافتہ مہذب متین اور سنجیدہ طبقہ سے بھرا ہوا تھا۔

باہر کی راہ داریاں بھی پر ہو گئی تھیں۔ یونٹی ہیلتھ کامپلکس کے ذمہ دار ڈاکٹر حبیب الرحمن صاحب نے اپنے خیر مقدمی کلمات میں اس فورم کے اغراض و مقاصد پر پہلے روشنی ڈالی اس کے بعد ایک اہم رکن الحاج گنی احمد نے تمام مہمانوں کا تعارف کرایا۔ بعد ازاں سوامی جی کی اس موضوع پر تقریر ہوئی۔ سوامی جی کی تقریر کے بعد حضرت مولانا نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھ کر اپنی تقریر کا آغاز کیا، اور ایسی جامع اور مؤثر تقریر فرمائی کہ باوجودیکہ اکثریت اردو سے نابلد تھی لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ زبان دل سے نکلے ہوئے کلمات دل کے تاروں کو چھیڑ رہے ہیں۔ اور واقعات و حالات کی ایسی عکاسی فرمائی گئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ بربط دل کے تاروں پر مضراب یقین کی شہنائی بج رہی ہے۔ اور ہر شخص بے خود ہو رہا ہے

حضرت مولانا نے فرمایا: اسلام کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیائے انسانیت کو رحم و آشتی کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ مالک حقیقی کے رحم و کرم کو اس کی مخلوق کے ساتھ رحم و کرم سے جوڑ دیا ہے۔ آپ کے فرمان کو حدیث کہا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا جس کو حدیث کے طالب علم کو سب سے پہلے شیوخ پڑھاتے تھے اس کو مسلسل بالاولیۃ ہی اس لئے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اسی حدیث کو پڑھاتے تھے: الراحمون يرحمهم الرحمن ارحموا من في الارض يرحمكم من في السماء۔

(رحم کرنے والوں پر رحمن رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا)

آپ نے فرمایا: حضرات آج زبان کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ اپنی ترقیوں کے باوجود کوئی ایسی چیز نہ ایجاد کر سکا کہ دل کے

(باقی صفحہ ۹ پر)

عالم اسلام

وصاف عالم ندوی

بلجیم میں مسلم برادری کی تشکیل اور مرکز اسلامی کا قیام:

دوسری عالمی جنگ کے بعد جرمنی کے جابرانہ کمیونزم طرز حکومت کے خوف سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے بلجیم ہجرت کر کے اس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس طرح ان مہاجرین نے وہاں اشاعت اسلام کی خشت اول رکھ دی تھی۔ پھر اسلامی ملکوں اور بلجیم کے مابین سفارتی تعلقات قائم ہوتے ہی اسلامی وفود، طلبہ کی جماعتیں، تاجروں اور کاریگروں کی جماعتیں بکثرت آنے لگیں اور بہت جلد وہاں اسلامی برادری کی تشکیل ہو گئی۔ یہ مسلمان اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے جد و جہد کرتے رہے، آخر کار یہاں دینی شعور کے حامل غیرتمند مسلمانوں نے "المرکز الاسلامی الثقافی" کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈال دی اور ۱۹۶۷ء کے ایک فرمان کے تحت تمام اداروں اور تنظیموں کو اسلامی سرگرمیوں کی بحالی کی غرض سے حکومت سے تسلیم کرا لیا۔

اس وقت بلجیم میں مسلم آبادی تقریباً ۵ لاکھ ہے جن میں تیس ہزار کی تعداد ان مسلم بچوں کی ہے جنھوں نے اسی سرزمین میں آنکھیں کھولی ہیں۔ ان کو یہاں کی شہریت بھی حاصل ہے۔ یورپ کے ممالک میں بلجیم کو مسلمانوں کے حق میں سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے کیونکہ مساجد کی تعمیر میں بلجیم کی حکومت بڑی فراخدلی کا ثبوت دیتی ہے اور دوسرے تحفظات بھی فراہم کرتی ہے وہاں کے ایک فرمانروا "بودواں" کے عہد حکومت میں چند ایسے فرامین صادر ہو گئے تھے جن کی رو سے اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور سکنڈری اسکولوں میں اسلامی تعلیم و تربیت بھی داخل نصاب کر لیا گیا۔

تمام مسلم حکومتیں وہاں کی راجدھانی بروکسل میں واقع اسلامی مرکز کی تعمیر میں حصہ لے رہی ہیں۔ اس مرکز کی حیثیت ایک متنوع مقاصد کی حامل اکیڈمی کی ہے جس کی عمارت چار منزلہ ہوگی اور کتبخانہ اور تحقیق اسلامی کا ایک ادارہ، ایک کشادہ و پرشکوہ مسجد (جس میں تین ہزار نمازیوں کی گنجائش ہو اور عورتوں کی نماز کے لئے ایک حصہ خاص ہو) پر مشتمل ہوگی۔ اس مسجد کے علاوہ وہاں کے باشندوں نے ذاتی کوششوں سے دو مسجدیں اور تعمیر کی ہیں۔

امریکہ نے اسرائیل کی نازبرداری کی خاطر، ۱۷ سال میں ۳۰ ویٹو استعمال کئے:

اقوام متحدہ کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۹ء تک، ۶۷ بار اپنا حق تنسیخ استعمال کیا ہے جن میں ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۹ء تک ۱۷ سال کی قلیل مدت میں اسرائیل [?] تیس بار اس نے اپنا ویٹو استعمال کیا ہے ان میں مشہور و معروف چند ویٹوؤں یہ ہیں۔

۱۹۷۲ء میں جب اسرائیل نے عرب اراضی پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا اور تمام ممالک کے خلاف امریکہ نے اسرائیل کے اس جرم کی مذمت کے خلاف اپنا حق تنسیخ استعمال کیا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں جبکہ اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا تھا اس وقت بھی امریکہ نے اس کو مجرم قرار دینے کے خلاف اپنا ویٹو استعمال کیا۔ اسی طرح ۱۹۷۶ء میں جبکہ اسرائیل بیت المقدس کی قانونی پوزیشن تبدیل کی تھی۔ امریکہ نے اس کی مذمت کے خلاف اپنا حق تنسیخ استعمال کیا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں جبکہ اسرائیل نے گولان کی پہاڑی کو غصب کر لیا تھا۔ اس وقت بھی اسرائیل کے مطالبہ پر امریکہ نے اپنا ویٹو استعمال کیا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں جبکہ اسرائیل نے حرم شریف میں خون خرابہ اور ظلم و زیادتی سے کام لیا تھا اس وقت بھی امریکہ نے اس کی مذمت کے خلاف اپنا ویٹو استعمال کیا تھا ۱۹۸۸ء میں بھی جبکہ اسرائیل نے جنوبی لبنان پر حملہ کیا تھا اس وقت بھی امریکہ نے اپنا حق تنسیخ استعمال کیا تھا ۱۹۸۹ء میں جبکہ اسرائیل نے فلسطینی انتفاضہ کی بیخ کنی کے لئے فلسطینی باشندوں کے ساتھ حد سے زیادہ تشدد سے کام لے رہا تھا تو امریکہ اس کی مذمت کرنے کے بجائے تمام دنیا کے خلاف اپنا ویٹو استعمال کیا تھا۔

ایک غیر مسلم کی زبان سے اسلامی قدروں کی تحسین

لندن میں اسلامی ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ (جس میں متعدد برطانی سیاست داں مختلف پارٹیوں کے نمائندے اور اسلامی ملکوں کے سفراء شریک تھے) کو خطاب کرتے ہوئے ایک ممبر پارلیامنٹ نیدی ٹیلر نے کہا مغربی ممالک کے ذمہ داران اچھی طرح جانتے ہیں عائلی مسائل کے ۵۰ فیصد حل اسلامی اصول و آئین سے ماخوذ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہماری آرزو ہے کہ ہمارے یہاں بھی اسی انداز سے سماج کی تشکیل ہو جس طرح اسلام میں سماجی قدروں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جہاں چھوٹوں پر شفقت، محبت اور ان کی پوری نگہداشت ہوتی ہے اور بڑوں کی توقیر و تعظیم سے چھوٹوں کے دل معمور ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اصول و اقدار اور باہمی محبت و اخوت و انسیت (جو ہماری مغربی دنیا میں نایاب ہیں) کا سرچشمہ اسلام ہے۔

سعودی عرب اور ترقی پذیر ملکوں کی امداد پر ایک نظر:

بین الاقوامی ترقیاتی فنڈ کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۹۰ء تک کی مدت میں تمام ترقی یافتہ معاون ملکوں میں سعودی عرب کا نام سر فہرست ہے اس نے ترقیاتی فنڈ میں جو رقم صرف کی ہے اس کی مجموعی تعداد ۶۲ ارب ڈالر ہے جن میں ۷۴ فیصد ہبہ عطایا کی شکل میں اور باقی رقم آسان شرطوں پر دیئے گئے قرضے ہیں جو ترقی پذیر اور تیسری دنیا کی ترقی و خوشحالی کے لئے دی گئی ہیں۔

ان بڑی بڑی رقموں کے خرچ سے یہ مقصود ہے کہ حکومت سعودیہ عربیہ اپنی اس پالیسی کو زندہ کرنا چاہتی ہے جو ۱۹۸۲ء کے بعد مختلف رکاوٹوں کی بنا پر جاری نہ رہ سکی تھی وہ یہ ہے کہ اپنے ترقی پذیر عرب ممالک کا تعاون کیا جائے جو برادرانہ تعاون کے دوسروں سے کہیں زیادہ حق دار ہیں۔

ایک نئی کتاب کی انوکھی تحقیق:

صدام حسین کے کویت پر جارحانہ اقدام اور سعودی سرحدوں پر فوجوں کے جماؤ پر استاد محمد اسعد نے اپنی ایک کتاب "سفينة الخير الكويتية قبل الاحتلال العراقي وبعده" میں ایک انوکھی تحقیق پیش کی ہے۔ اس کتاب کے شروع میں رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری عبداللہ عمر نصیف کا ایک وقیع مقدمہ بھی ہے جس میں انھوں نے دعوت و ارشاد کے میدان میں کتاب کی افادیت اور صدام حسین کے اس وحشیانہ اقدام سے عالم اسلام خصوصاً فلسطین کی تحریک انتفاضہ اور افغان مجاہدین کو جو عظیم نقصان پہونچا ہے اس پر مکمل روشنی ڈالی ہے۔ استاد محمد اسعد نے اس کتاب میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ صہیونیوں نے عراقی جارحیت کے متعلق تجربے اس واقعہ کے رونما ہونے سے بہت قبل کر لیا تھا اور اس کو سنیما کے پردے پر مشاہدہ بھی کر چکے تھے تاکہ اس کے نقائص کو دور کر کے صدام حسین کو پیش کیا جا سکے تاکہ وہ اس ڈرامہ کو بعینہ و بخوبی عملی جامہ پہنا سکیں اس کتاب میں ان فلموں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جس کی شوٹنگ مقبوضہ فلسطین میں دو سال قبل ہو چکی تھی جس میں اسرائیلی ایکٹرسوں نے تمام کردار ادا کیا ہے۔ ان ہی فلموں میں "الدرع الافضل" کے نام سے ایک فلم جو ۱۹۸۸ء میں مکمل ہو گئی تھی، جو بات حیرت انگیز ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب میں اس فلم کے بعض سین کا تذکرہ کیا گیا ہے عراقی فوجوں کو کویت پر حملہ کرتے ہوئے اور کویتی باشندوں کو ذبح کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، طرفہ تماشا یہ ہے اس فلم کی تکمیل اس واقعہ کے وجود سے چھ سال قبل ہو چکی تھی۔

استنبول کا کتب خانہ:

استنبول کا کتبخانہ سلیمانیہ اپنی نوادرات اور مخطوطات میں دنیا بھر کے کتبخانوں میں مشہور ہے اور تعداد و اہمیت دونوں ہی حیثیتوں سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اس کتبخانہ کی تعمیر استنبول کی فتح کے سو سال بعد ۱۵۴۹ء میں سلطان سلیمان قانونی بن سلطان سلیم اول عثمانی نے کی ہے اس کتبخانہ کے تحت ۱۰۸ کتبخانے اور ہیں جو خاص و عام کے لئے استفادہ کا اہم ذریعہ بنے ہوئے ہیں یہ کتبخانہ محققین عالم کے لئے مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے محققین کی ایک بڑی تعداد مستفید ہو رہی ہے یہ کتبخانہ کئی عمارتوں پر مشتمل ہے جس میں ایک پرشکوہ اور کشادہ مسجد اور مدرسہ قدیم کی دس عمارتیں بھی شامل ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں اسلامی مخطوطات کی تعداد سوا لاکھ تک پہونچتی ہے اور استنبول کے تمام کتبخانوں کے مخطوطات کی مجموعی تعداد تقریباً ۲ لاکھ ہے جس کی ترتیب یوں ہے کتبخانہ قصر توپکاپی میں ۱۲ ہزار اور استنبول یونیورسٹی کی لائبریری میں ۱۷ ہزار اور اس کے علاوہ کتبہ بایزید اور استنبول کی چھ یونیورسٹیوں میں مخطوطات کی ایک بھاری تعداد موجود ہے اس کے اندر کتابوں کی جلد سازی اور مخطوطات کی اصلاح مرمت سازی کا بھی ایک شعبہ ہے مزید محققین کی آسانی کے لئے فوٹو کاپی اور نقل نویسی کا بھی انتظام ہے۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی بعض بیش بہا اور گرانقدر مخطوطات بھی ہیں جن کی اگر قیمت لگائی جائے تو کروڑوں ترکی سکہ برابر ہوگی بتایا جاتا ہے کہ ایک ترک نے کتبخانہ سلیمانیہ کو اپنا ایک کتبخانہ ہدیہ کیا جس کی مجموعی قیمت دس ملین ترکی سکے کے مساوی ہے جس میں تنہا ایک کتاب کی قیمت ۱۰ ملین ہے

(باقی ص…)